يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ

الحمد للہ والمنۃ کہ
تفسیر لاثانی گنجینہ اسرار آیات قرآنی
المسمی بہ

تحفہ احباب

مولفہ

جامع معقول و منقول غواص بحر معانی نکتہ شناس طب یونانی
مولانا حکیم محمد ابراهیم صاحب حمانی

—— :جسمین: ——

مولف علامہ نے چند قرآنی آیات سے عموماً جملہ احزاب باطلہ کے خیالات فاسد
دا آریہ جماعت کے بعض مایہ ناز اعتراضات کا خصوصاً دندان شکن جواب دیکر تین باتون پر
زیادہ محققانہ روشنی ڈالی ہے، اول یہ کہ کتاب اللہ کی آیات مین ہرگز اختلاف
نہین ہے بلکہ فرقان حمید کی ہر آیۃ ایک دوسری کی موید مفسر ہے، دویم یہ کہ انبیاء
علیہم السلام کے متعلق غلط روایتون کی عالمانہ تردید کرکے قرین عقل مطالب بیان کیے ہین
سوم یہ کہ جملہ قصص قرآنیہ مین ہر زمانہ کے لوگون کیلئے کارآمد نصائح موجود ہین۔
غالباً مولف ممدوح کی یہ تفسیر اس خاص طرز مین پہلی مثال ہے حسب ارشاد

مولف عم فیضہ کے کمترین محمد معز الدین
بہاری نے

باہتمام ... الیکٹرک پریس کلکتہ ۱۹۲۵ء مین چھپوایا

فہرست مضامین تحفہ احباب

(تحفۂ احباب)

بِسمِ اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدک یا من نور قلوب لعلماء باسرار القران - ونصلی ونسلم علی من محبتہ عین الایمان - وعلی الہ واصحابہ وازواجہ اجمعین - اما بعد امیدوار رحمت باری بندہ ضعیف محمد ابراھیم بہاری ابن مولانا حافظ معین الدین صاحب مرحوم - ساکن موضع اوگانوان ضلع پٹنہ حال مقیم شہر بہاگل پور عارض ہے کہ اس زمانہ مین مین دشمنان اسلام نے مختلف طریقہ سے . . . . نخل اسلام کی بیخکنی کے اسباب مہیا کرد ئے ہین - چنانچہ بعض گروہ تو اپنے کو مسلمان کہکر ایات قرآنی کی غلط تاویلین کر کے سلف صالحین کے مسلمہ عقاید سے عوام کو بہکاتے ہین - اور بعض کہلم کہلا کلام مجید پر اعتراض کرتے ہین - اور اسمین بزعم خود اختلاف وتعارض دکہاکر جاہلون اور عقیدہ کے کمزور انسانونکو فوراً دام تزدیر مین پھانس لیتے ہین - گرچہ علمار کرام نے ان باطل پرستون کے تمام اعتراضات کا جواب کافی اور مسکت طریقہ پر اپنی کتابون مین دیدیا ہے - اور اکثر مواقع پر بذریعہ مباحثہ اور مناظرہ کے

ان بیدینون کا سارا مکر و فریب ظاہر بھی کر دیا ہے۔ مگر حسب منطوق آیۃ کریمہ کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا ایاتہ ولیتذکر اولوا الالباب کے ہر مسلمان کو اس کتاب مین تدبر کرنا ضرور چاہئے۔ لہذا اس خاکسار کو ہنگام تحصیل سے فن تفسیر کیساتھ ایک خاص دلچسپی ہے۔ اور جب کسی علمائے متقدمین کی کوئی مستند تفسیر ملی اسکو غور و شوق سے پڑھتا۔ اور اسلاف کے بیان کردہ نکات کو اپنی یادداشت اور مزید بصیرت کیواسطے لکھہ لیا کرتا تہا۔ اور اگر مجھہ پر از خود کسی ایت کے متعلق کوئی بات منکشف ہوئی بس میری یہ عادت تھی کہ قدما محققین کے اصول تفسیر پر اسکو جانچکر دیکھنے کے بعد اسکو بھی قلمبند کر لیتا تہا۔ یا میرے تلامذہ و احباب نے جب کبھی مجھسے کسی آیت کے متعلق کوئی سوال کیا اور میرے جس جواب سے سایل کی تشفی اور طمانیت ہو جاتی تہی۔ اسکو بھی مین اپنی عادت کے مطابق لکھہ لیا کرتا تھا۔ الغرض اس طریقہ سے متفرق ایات کی تفسیر مین ایک چھوٹا سا گلدستہ میرے پاس جمع ہو گیا تہا۔ جسکے متفرق مضامین کو ہمنے بعبارت عربی سنہ ۱۳۴۲ ہجری مین یکجا کرکے **لوامع التفاسیر** کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔

چونکہ اس کتاب کو قدر والون نے ضرورت زمانہ کے حسب اقتضا ر پایا۔ اور بعض اوہام باطلہ کا مسکت جواب بہی اسمین میرے مخلصون کو نظر آیا۔ لہذا احباب کا یہ اصرار ہوا کہ اگر اسکا ترجمہ اردو مین ہو جاوے تو غیر علمار کیلئے یہ کتاب بہت نافع ہو۔ الغرض یہ رسالہ جو اسوقت آپکے سامنے ہے یہ

اسی لوامع التفاسیر کا ترجمہ ہے جسکا نام ہمنے بوجہ مناسب مذکورہ صدر کے تحفۂ احباب رکھا ہے اصل اور ترجمہ مین فرق اسقدر ہے کہ لوامع التفاسیر چونکہ صرف میرے واسطے تہی لہذا اسمین اختصار کا پہلو ہر جگہ ملحوظ ہے اور تحفہ چونکہ دوسرون کے فرمایش سے ہے اسلئے اسمین کسیقدر وضاحت کردی گئی ہے - اس ذرہ نواز کی درگاہ مین عاجزی کیساتھ دعا کرتا ہون کہ میری اس حقیر تالیف کو وہ مقبول بناوے اور مجھکو اور مسلمانونکو اس سے نفع بخشے - اور اس کتاب کو میرے واسطے وسیلہ نجات اور ذریعہ آمرزش بناوے - آمین - منصف مزاج ناظرین سے التجا ہے کہ مجھہ قلیل البضاعۃ کی گمنامی کے باعث اس تحفہ کو غیر معتبر نہ سمجھین بلکہ انظر الی ما قال پر عمل فرمائین - انشاء اللہ اسکے بیشتر مضامین کو مفید اور تفسیر کبیر وکشاف وصحیحین وانکی شرح عینی ومثنوی مولانا روم وغیرہ سے مستند پاوینگے - لہذا اہل کمال سے اس ایک شعر مین میری درخواست ہے ؎

چو بینے پسند آیدت از ہزار   بمردی کہ دست از تعنت بدار

وما توفیقی الا باللہ وھو حسبی ونعم الوکیل -

قَالَ عَزَّ اِسْمُہٗ کَیْفَ تَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (سورہ بقر) تم کیونکر خدا کے ساتھ کفر کرتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے - پس خدا نے تمکو زندہ کیا پھر وہی تمکو نابود کرے گا اور پھر وہی تمکو جلا دیگا - پھر اسی کے طرف تملوگ لوٹو گے - بعض لوگ حیات قبر کے

منکر ہین انکو اس آیت مین غور کرنا چاہیے کہ ثم یحییکم سے حیات قبر کا ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ لفظ ثم کلام عرب مین واسطے تراخی کے مستعمل ہے پس ثم یحییکم سے بجز حیات القبر کے اور کوئی زندگی مراد لینا خلاف اصول عرب ہے کیونکہ قبر کی زندگی اور رجوع الی اللہ مین توبیشیک بوجہ مہلت اور تراخی کے ثم کا فائدہ باقی رہتا ہے۔ اور حیات ابدی جو کہ بعد نفخ صور حاصل ہوگی اس حیات کے بعد توفی الفور رجوع الی اللہ حاصل ہوگا۔ الغرض مردہ چند لمحہ کیواسطے زندہ کیا جاتا ہے اور اسی حالت مین اس سے نکرین سوال کرتے ہین۔ مفصل حالت اسکی حدیثون مین مذکور ہے۔ قال عز اسمہ واذ قلنا للملئکتہ اسجدوا لادم فسجدوا الا ابلیس سورہ بقر۔ جب ہمنے فرشتون سے کہا کہ تم سب ادم کو سجدہ کرو تو بجز ابلیس کے سبنے سجدہ کیا۔ اس بات پر تو مسلمانون کا اجماع ہے کہ وہ سجدہ جو فرشتون نے حضرت ادم علیہ السلام کو کیا تھا۔ وہ سجدہ عبادت ہرگز نہین ہے۔ کیونکہ سجدہ عبودیت لغیر اللہ کفر ہے۔ بلکہ علمائے محققین کے نزدیک وہ سجدہ بھی خاص خدا ہی کو تہا۔ اور آدم علیہ السلام مثل قبلہ کے تھے اگر کوئی یہ شبہ کرے کہ جب ایسی بات تھی تو بجائے اسجدوا لادم کے اسجدوا الی ادم ہوتا۔ جواب اسکا یہ ہے کہ گرچہ اکثر لام واسطے تخصیص کے آتا ہے . . . .

. . . . لیکن قرآن مجید

مین غیر معنی تخصیصی مین بھی لام استعمال کیا گیا ہے مثلاً اقم الصلوٰۃ لدلوک
الشمس حالانکہ نماز دلوک شمس کیلئے ہرگز نہین ہی بلکہ واسطے خدا کے ہے۔
اور بعضون کے نزدیک وہ سجدہ تعظیمی تہا حضرت آدم کیلئے۔ بہرکیف حضرت
آدم علیہ السّلام خواہ مسجود بسجدہ تعظیمی ہون یا بطور قبلہ ہون۔ اس قصہ سی بنی
آدم کو یہ نفع پہونچتا ہے۔ تاکہ انسان کو یہ بات معلوم ہو جاوے کہ اللہ نے ہمکو
ایسی شرافت بخشی ہے کہ اپنی بہترین مخلوق یعنی ملایکہ کو بھی میرے سامنے جہکا
دیا۔ پس ایسا ممتاز مخلوق اگر کسی مخلوق مثلاً شمس و قمر حجر و شجر آگ دریا وغیرہ
کو سجدہ کرے تو اسنے اپنی قدر نہین جانی اور احسان آلہی کی کمال ناشکری کیا
اسلئے انسان کو زیبا نہین ہے کہ وہ بجز وحدہ لاشریک لہ کے کسی غیر کو سجدہ
کرے۔ دوسرا فایدہ یہ ہے کہ علم کی رفعت شان تبلائی گئی۔ کیونکہ جمیع اوصاف
وکمالات انسانیہ مین علم ہی وہ کمال ہے جو کہ موقعہ تقابل و امتحان مین
بکار آمد ثابت ہوا۔ اور یہی وہ شئی ہے کہ جسنے انسان کو لقد کرمنا بنی
آدم کا مصداق بنا دیا۔ انبیاء علیہم السّلام کی جماعت مین بھی جس ذات
کو معجزہ علمی سے مالامال بنایا اسیکو سید المرسلین اور خاتم النبیین کا معزز
سہرا ابھی عطا کیا اور وہ مقدس ذات کون ہے یعنی ہمارے پیشوا شافع
محشر ساقی کوثر جناب محمد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور فایدہ یہ ہی
کہ اہل علم کی اور خاصکر معلم کی عظمت و توقیر کا طریقہ تبلا یا گیا کہ دیکھو استاد

اگر تمسے کمسن بھی ہو اور باقی ہنر مین تم استاد سے زیادہ بھی ہو لیکن جسنے تمکو علم کی بات بتائی ہو وہ واجب التعظیم ہے شیطان عبادت وغیرہ مین حضرت آدم سے باوجودیکہ زیادہ تھا لیکن جب اسنے صاحب علم کی توقیر سے روگردانی کی تو ہمیشہ کیواسطے ملعون کر دیا گیا۔ پھر حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے قصہ کے ذریعہ سے بھی ہمکو وہ طریقہ تبلایا گیا کہ اہل علم کے صحبت مین کیسے رہنا چاہیئے۔ دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام کتنے بڑے جلیل القدر نبی ہین۔ مگر جسوقت علم کی تلاش مین حضرت خضر کے پاس پہونچتے ہین تو فرماتے ہین ستجدنی ان شاء الله صابرا ولا اعصی لك امرا ہ ان شاء اللہ آپ مجھکو صابر اور فرمانبردار پاوینگے۔ اور مین ایک کام مین بھی آپ کی نافرمانی نہین کرونگا۔ اب سنئے کہ حضرت خضر علیہ السلام یہ فرماتے ہین کہ اچھا تم میرے ساتھ رہو لیکن دیکھو بے موقعہ تم کسی بات کو ہمسے دریافت نکرنا۔ ہم خود جب مناسب سمجھینگے تب تبلادینگے چونکہ قرآن ہماری ہدایت کیلئے ہے۔ اسلئے اسکے ہر قصون مین بھی ہمارے لئے کوئی عمدہ تعلیم ہے۔ چنانچہ قصہ مجمع البحرین کا بھی میرے واسطے یہ تعلیم کہتا ہے کہ شاگرد اور استاد کو اسطرح رہنا چاہیئے۔ بموجودگی استاد کے شاگرد کو کبھی بلا اذن استاد کے لب کشائی نہین چاہیئے۔ اور عام مسلمانون کو لازم ہے کہ علمار کی توقیر کرین۔ خواہ وہ عالم باعمل ہو یا نہو کیونکہ اعمال کی جوابدہی اسکے سر ہے وہ اسکی سزا بھگت لیگا۔ اگرچہ اعمال اسکے برے ہین

ہمین تو اسکے علم کی قدر کرنی چاہیئے۔ لیکن زمانہ نے وہ پہلو بدلا ہے کہ سب سے زیادہ ناقابل التفات علما سمجھے جاتے ہین حالانکہ ہمکو یہ تبلایا گیا تہا کہ ؎

گفت عالم بگوش جان بشنو | ور نہ باشد بگفتنش کردار
مرد باید کہ گیرد اندر گوش | گر نبشتت پند بر دیوار

مگر عوام کی کیا شکایت کی جاوے ابتو علماؔ کا رنگ بھی بدلگیا ہے اکثر ایک مولوی دوسرے مولوی کی تضحیک اور تحقیر کے درپئے نظر آتے ہین۔ "چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی" الغرض ان آیات مین تدبر کرنیسے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب انسان نے تحصیل علم نہین کیا گویا اسنے مابہ الشرافت وصف کو اپنے کہو دیا۔ اسی مسئلہ کو سعدی نے اس شعر مین تبلایا ہے۔ ؎

بنی آدم از علم یابد کمال | نہ از حشمت وجاہ ومال ومنال
سرانجام جاہل جہنم بود | کہ جاہل نکو عاقبت کم بود

ہان جو عالم بدعقیدہ ہو جاوے وہ البتہ قابل نفرت ہے۔ نہ اس سے ملنا چاہیئے نہ اسکی بات ماننی چاہیئے۔ قال عز اسمہ لا یقبل منہا شفاعتہ الخ سورہ بقر یہ آیت مخصوص ہے کفار اور مشرکین کیواسطے کیونکہ مسلمانون کے سب فرقہ اس بات پر متفق ہین کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم اہل کبائر کی بھی ضرور شفاعت فرماوینگے۔ اور حضور کی شفاعت امت عاصی کو مفید بھی ہوگی۔ صرف معتزلہ کا عقیدہ یہی کہ آپ کی شفاعت اہل کبیرہ

کیلئے نہین ہی۔ کیونکہ انکے یہان سقوط عذاب کے غرض سے شفاعت نہین ہے بلکہ صالحین کے درجات شفاعت سے بڑھائے جاتے ہین۔ لیکن اس عقیدہ کی کمزوری احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

قال عز اسمہ کونوا قردۃ خاسئین سورہ بقر یعنی بنی اسرائیل کی ایک نافرمان جماعت کو خدا نے بندر بنا دیا تھا۔ تاکہ لوگون کو عبرت حاصل ہو۔ آریہ جماعت کی نافہمی ملاحظہ ہو وہ کہتے ہین کہ تناسخ کا ثبوت قرآن سے ملتا ہے۔ اور اسی آیت کو استدلال مین پیش کرتے ہین۔ جسکا جواب یہ ہے کہ تناسخ کے معنی لغوی یہ ہین کہ زایل ہونا روح کا ایک قالب سے اور داخل ہونا دوسرے قالب مین۔ اور مطابق عقیدہ آریہ وہنود کے تناسخ یا اواگون یہ ہے کہ روح جب جسم سے نکلتی ہے۔ تو ہوا مین ماری ماری پھرتی ہے۔ پھر بذریعہ سلسلہ تولید کے کسی دوسرے جسم مین وہ داخل ہوتی ہے۔ اب تبلائے کہ مسخ کو تناسخ سے کیا نسبت ہے۔ مسخ مین تو قالب وہی موجود ہے روح اس سے باہر نہین ہوئی۔ بلکہ وہی جسم متشکل بشکل بندر ہو گیا تھا۔ اکثر بیماریون مین بھی انسان کی شکل بدل جاتی ہے تو اسے بھی کیا تناسخ کہدینگے تب تو مرض چیچک وغیرہ کے بعد ممکن ہے کہ کبھی جورو سے

بھی بدخلقی ہو جائے۔ قال عز اسمہ اِنَّ اللہَ یَأمُرُکُم ان تذبحوا بقرۃ سورہ بقر۔ حاصل اس قصہ کا یہ ہے کہ بنی اسرائیل مین ایک آدمی مقتول ہوا تو لوگون نے قاتل کا پتہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا جسپر حضرت

موسیٰ نے یہ فرمایا کہ اللہ پاک کا حکم یہ ہے کہ تملوگ ایک گائی ذبح کرو کہ اسی سے قاتل
کا پتہ ملجاویگا۔ چنانچہ گائی ذبح کیگئی۔ اور اسکے کسی حصہ جسم سے مقتول کوجب مارا گیا
پس وہ زندہ ہو گیا۔ اور اسنے خود اپنے قاتل کا نام تبا دیا۔ اب سوال یہ ہے کہ وجہ تخصیص
گائے کی کیا تھی اور جانوروں سے بھی یہ مقصود حاصل ہو سکتا تہا جواب چونکہ سامری
نے ایک مرتبہ گوسالہ پرستی کو بنی اسرائیل مین مروج کیا تہا جسوقت کہ حضرت موسیٰ
علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لیگئے تھے جب واپس آئے تو سامری کو بد دعا دیکر نکال
دیا۔ اور اس گوسالہ کو جلا کر دریا مین اسکی راکھہ بہا دیگئی لہذا گائے کے تخصیص مین
اس امر کا اشارہ ہی کہ کسی جانور مین معبودیت کی صلاحیت نہین ہی بلکہ گائی کو
خدا نے انسان کے نفع اور رفع ضرورت کیواسطے پیدا کیا ہے۔ خواہ اسکی زندگی
سے نفع لو خواہ اپنی ضرورتون مین تم اسکی جانون کو صرف کرو چونکہ ہندوستان مین بھی گائے
کی پرستش ہوتی ہے اسی لئے اس کی شان معبودیت کو باطل کرنے کے لئے ہندوستان
مین بھی زیادہ تر گائی کی قربانی لوگ کیا کرتے ہین۔ ممکن ہے کہ گوسالہ پرستی کا موجد
ہندوستان مین بھی سامری ہوا ہو یا اسکے ذریات کیونکہ حضرت موسیٰ نے اسکو قتل
نہین کیا تھا بلکہ یہ فرمایا کہ فاذھب فان لک فی الحیاۃ ان تقول لا مساس
یعنی نکل جا تجھے زندگی مین چین اور ٹھکانہ نہین ہو گا۔ شاید وہ اسی حالت مطرودیت
مین ہند بھی ایا ہوا اور اس مشرکانہ عقیدہ کی ترویج کی ہو اور اب بوجہ مرور
زمانہ کے یہ عقیدہ ہنود کے دلومین مستحکم ہو گیا ہی کہ جب اسلام خالص توحید کی
دعوت دیتا ہی تو یہ خفا ہوتے ہین۔ اور بگڑ جاتے ہین دوسرا سوال یہ ہے کہ اتنے

اوصاف سے موصوف گائے جوکہ تسر الناظرین کی مصداق ہو اسکی تخصیص کیون کیگئی
جواب یہ ہے کہ اسمین فائیدہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جوکہ دلکو لبھانیوالی ہو انسان کو چاہیے
کہ اسکو راہ خدا مین قربانی کردے۔ تاکہ قلوب مردہ اس سے زندہ ہون اور حیات
ابدی پاوے۔ جیسا کہ لن تنالوا البرحتی تنفقوا مما تحبون سے مفہوم ہوتا ہے

قال عز اسمہ واتبعوا ما تتلوا الشیاطین علی ملك سلیمن سورۂ بقر
یعنی لوگون نے خدا کی کتاب کو چھوڑ کر اس شئی کی پیروی کرلی تھی جسکو جناتون نے
عہد سلطنت مین حضرت سلیمان علیہ السلام کے مشہور کر رکھی تھی یعنی شیاطین
الجن آدمیون کو سحر کی تعلیم دیتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام
کی سلطنت بھی علم کے سبب سے قائم تھی۔ اور چونکہ سحر کا استعمال کفر ہے لہذا
خدا نے اس آیت مین اسکو تبلا دیا کہ سلیمنؑ نے ہرگز کفر نہین کیا ہے ......

....

... یعنی سحر کا استعمال نہین کیا ہے۔ ما کفر سلیمن لیکن تعلیم سحر کفر نہین ہے
جیسا کہ وما انزل علی الملکین سے معلوم ہوتا ہے کہ دو فرشتے بغرض
تعلیم سحر کے بھیجے گئے تھے حالانکہ ملایکہ سب کے سب معصوم عن الکفر ہین۔ پس ہرگز
مجرد تعلیم سحر کفر نہین ہے۔ لہذا ان فرشتون کی تعلیم بغرض استعمال نہین تھی
بلکہ بغرض امتحان کے کہ کون شخص باوجود قدرت اور دانست کے استعمال سحر سے
محترز رہتا ہے۔ اور کون نہین اور شیاطین تعلیم سحر کے ساتھ استعمال کی تحریص دلاتے

تھے۔ بس دونون تعلیم مین فرق ظاہر ہے۔ لہذا ایک مذموم اور دوسرا غیر مذموم جیسے ہم لوگون کے لئے انگریزی تعلیم کہ فی نفسہ بری نہین ہے لیکن اسکو حاصل کر کے خدا سے غافل ہو جانا یہ بُرا ہے چونکہ علمائنے یہ دیکھا کہ اس علم کا نتیجہ شاید دین سے بیخبری ہو جاوے۔ لہذا شروع زمانہ مین لوگ اسکے مخالف تھے اور سر سید نے دیکھا کہ مذہب سے کوئی برائی تو ہے نہین انہون نے اسکی قوم کو ترغیب دی قوم نے انکے قول کو تو مان لیا لیکن سید کے فعل کو بھلا دیا ہان وہ انگریزی دان جنکو مذہبی معلومات کا بھی شوق ہوا اور جنکو احکام اسلام کی پابندی بھی ہو اسکو علمائی بھی اچھا سمجھتے ہین اور اسکو سید بھی اچھا جانتے ہین۔ اور جسنے انگریزی تعلیم کے زیر اثر ہو کر مذہب کو خیر باد کہدیا وہ جیسے علمائ کے نزدیک بُرا اس سے زیادہ تر سید کی روح انسے ناراض۔ الغرض اسلام کا پابند رہکر مسلم جو کرے وہی اچھا ہے۔

قال عزاسمہ وما ننسخ من ایتہ اوننسہا الخ سورہ بقر نسخ کے معنی لغت مین یہ ہین۔ کہ مٹا دینا کسی چیز کا دوسرے چیز سے لیکن نسخ اصطلاحی یہ ہے کہ ایک آیت کا حکم موقت انتہأ عمل مین دوسری آیت سے بدل جاوے لہذا محققین کے نزدیک منسوخات قرانیہ مین صرف چار پانچ آیئتن ہین اور باقی مواضعات مین کوئی قید ہے جیسے تخصیص عام وغیرہ بہر کیف نسخ سے ذات باریتعالی مین کوئی نقص نہین لازم آتا ہے کیونکہ جب یہ حکم موقت تھا

تو بعد بدل جانے مصلحت کے حکم بھی بدل گیا۔ بلکہ ایسا نسخ تو اہل کتاب کے یہان خود موجود ہے جیسے اجتماع اختین کے حضرت یعقوب علی نبینا و علیہ السلام کے عہد تک جائز تھا یا حقیقی بہن سے نکاح بعہد آدم علیہ السلام پھر جب ضرورت نرہی تو یہ احکام موقتہ بھی بدلتے گئے۔ بلکہ نصاری کے یہان تو بعد حضرت مسیح علیہ السلام کے بھی نسخ ہوا ہے۔ جیساکہ انجیل لوقا باب ۲ سے ثابت ہے کہ پولوس نے اپنے وقت مین رسم ختنہ موقوف کیا ہے۔ حالانکہ حضرت مسیح خود مختون ہین اور مسلمانون کے یہان تو بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسیکو قرآن مجید مین ایک آیت کی کمی یا بیشی کا اختیار نہین ہے ....

.... خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک مین قرآن مجید کامل اور پورا ہو گیا ہے

ملخصاً من الحقانی قال عز اسمہ سیقول السفہاء من الناس ما ولٰهم عن القبلة التی کانوا علیہا سورہ بقر چند ماہ تک بیت المقدس کے طرف رخ کرکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی پھر بدستور سابق بیت اللہ قبلہ قرار پایا۔ پس بعد تحویل قبلہ کے منکرین نے یہ اعتراض کیا کہ نسخ فعل تو کسی مصلحت کیوجہ سے ہوتا ہے پھر اس تحویل قبلہ مین کونسی مصلحت ہے کیونکہ جہات اربعہ تو سب مساوی حیثیت رکھتے ہین۔ جسکا جواب یہ دیا گیا کہ قل للہ المشرق والمغرب یعنی فی نفسہ کسی جہت مین تخصیص قبلہ کی

کوئی وجہ نہین ہے بلکہ محض حکم خدا سے کوئی جہت قبلہ کے لئے متعین ہوتا ہے

واضح ہو کہ افعال مین غرض مصلحت کی دو صورتین ہین ایک تو یہ کہ اس کام مین کوئی حکمت اور غرض پائی جاتی ہے۔ اور اس کام سے فلان فلان ضرورت رفع ہوگئی پس اسمین تو کوئی شک نہین کہ خدا کے کام مین بھی ضرور حکمت ہوتی ہی اور بندہ کی اسمین کچھہ بھلائی نکل آتی ہے اور دوسری صورت یہ ہی کہ کام کا کسی غرض پر موقوف ہونا پس مطابق عقیدہ اہلسنت کے افعال خدا کا کسی غرض وعلت پر موقوف ہونا ضروری نہین ہے۔ اور عدم وجوب علت لافعالہ تعالی کی ایک دلیل یہ ہی کہ اگر وہ کام کسی غرض پر موقوف ہے تو دو حال سے خالی نہین یا تو وہ غرض قدیم ہوگی یا حادث بصورت قدیم ہونیکے قدامت فعل لازم آویگی اور یہ محال ہے اور بصورت حادث ہونیکے یہ غرض اپنے وجود مین محتاج ہے دوسری غرض کیلئے پس یا تو دور لازم آویگا یا تسلسل اور چونکہ دور تسلسل دونون محال ہے۔ اور جو شی مستلزم محال ہو وہ خود بھی محال ہے۔ لہذا افعال خدا کا موقوف کسی غرض پر ہونا محال ہے کسی غرض کا پایا جانا اور کسی غرض پر موقوف ہونا ان دونون مین نہایت باریک فرق ہی جو غور کرنیکے بعد سمجھہ مین آجاتا ہی موقوف بغرض ہونا فعل خدا کا منافی شان الوہیت ہے ہان اسمین میرا کوئی نفع ہو کیونکہ فعل الحکیم لا یخلوا عن الحکمۃ لہذا ممکن ہی کہ مسجد حرام کو قبلہ قرار دینے مین اس امر کے طرف اشارہ ہو کہ مسلمانو نکو

سب کام مین میانہ روی اختیار کرنا چاہئے کیونکہ کعبہ وسط زمین واقع ہے اور خیر الامور اوسطہا بھی اسی کا موید ہے۔

قال عز اسمہ فمن عفی لہ من اخیہ شیٔ الخ (سورۂ بقر) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت سے فاسق کا مومن ہونا ثابت کیا ہے اسطور پر کہ اللہ پاک نے قاتل عمد اور ولی الدم کے درمیان مین رشتۂ اخوت قایم رکھا ہے۔ کیونکہ من اخیہ فرمایا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ قاتل کیساتھ اخوت ایمان کے سبب سے ہے پس اگر بوجہ فسق کے ایمان باقی نہین رہتا تو وہ اخوت اسلامی بھی قایم نہین رہتی۔ ہان قتل عمد بالاتفاق کبیرہ گناہ ہے۔ اب من قتل مومنا متعمداً فجزاءہ جہنم خالدا فیہا سے وہ قاتل مراد ہے کہ جسنے کسی مومن کو قصداً محض بوجہ اسکے مومن ہونیکے قتل کیا ہو نہ کسی اور سبب سے پس ایسے قاتل کا ایمان البتہ سلب ہو جاتا ہے۔

قال عز اسمہ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان سورہ بقر یعنی ہم دعا کرنے والون کی دعا کو قبول کرتے ہین اگر کوئی یون شبہ کرے کہ اکثر آدمی نہایت تضرع اور الحاح سے دعا کرتے ہین لیکن قبول نہین ہوتی ہے تو اسکا جواب یہ ہے کہ گرچہ یہ آیت متعلق دعا کے مطلق ہے لیکن دوسری آیت اس امر مین مقید بھی ہے بل ایاہ تدعون فیکشف ماتدعون الیہ ان شاء۔ اور مطلق مقید پر محمول ہوا کرتا ہے۔ علاوہ اسکے خدا نے یہ فرمایا ہے

کہ ہم دعا قبول کرتے ہین نہ یہ کہ فی الحال قبول کرتے ہین۔ پس اگر کسی داعی نے
اپنے دعاء کا ثمرہ عاقبت مین پالیا تب بھی اجابت کا مصداق ہوگیا۔ چنانچہ
حدیث مین آیا ہے کہ مومن کی دعاء ضرور مقبول ہے خواہ دنیا مین پاوے یا ثمرہ
دعاء آخرت مین ملے قال عز اسمہ حتی یقول الرسول و الذین آمنو معہ
متی نصر اللہ (سورہ بقر) یعنی جسوقت کہ رسول اور مومنین یہ کہینگے کہ کب
اللہ کی مدد آئیگی الا ان نصر اللہ قریب جواب ملا خبردار ہو کہ مدد کا وقت
قریب ہے۔ اس جواب سے یہ بات معلوم ہوئی کہ سوال وقت قرب مدد سے تہا
نہ کہ مطلق وقوع نصرت سے کیونکہ انبیاء و رسل علیہم السلام کو اللہ کے وعدہ
اور وعید پر پورا اعتماد ہوتا ہے انکو نفس وقوع نصرت مین شک ہونا دشوار
ہے۔ قال عز اسمہ ان اللہ مبتلیکم بنہر سورہ بقر اس آیت مین
بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ یون مذکور ہے کہ انلوگون نے اپنے وقت کے نبی
سے اس امر کی خواہش ظاہر کی کہ ہملوگ کو جالوت سے لڑنیکی اجازت دیجئے
چونکہ جالوت اس قوم کا دشمن تہا۔ المختصر نبی نے اُنہون کو جالوت سے لڑنیکے لئے
طالوت کی ماتحتی مین روانہ کیا۔ جب لشکر روانہ ہوا تو سپہ سالار نے یہ کہا کہ
دیکھو راستہ مین تملوگونکو ایک نہر ملیگی۔ خبردار اسکا پانی بشکم سیر ہو کر
نہین پینا۔ کیونکہ وہ نہر جانچ کیلئے ہے تاکہ تمہارے صبر اور تحمل کا امتحان ہوجاوے
دیکھو جو کوئی بہت زیادہ پانی اس نہر سے پئیگا۔ وہ میری جماعت سے

نکل جاویگا یعنی نکما اور بیکار ہو جائیگا۔ ہان اگر شدت پیاس مین کسی نے دو ایک
گھونٹ پی لیا تو کچھہ مضایقہ نہین۔ الغرض جب وہ نہر ملی تو بجز چند آدمیون
کے سبھون نے خوب جی کھولکر اس نہر سے پانی پیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مقابلہ کے
وقت وہ سب بیکار ہو گیے اور کہنے لگے کہ لا طاقۃ لنا الیوم بجالوت وجنودہ
الآیۃ یعنی اب ہمکو جالوت سے لڑنیکی طاقت نہین ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے
کہ یہ قصہ قرآن مین لایا گیا ہے۔ اور قرآن کا مقصد قصہ گوئی تو ہے نہین۔ بلکہ
جمیع قصص قرآنیہ مین مسلمانون کیواسطے کوئی عبرت اور تعلیم ہوتی ہے۔
جیسا کہ قصہ یوسفؑ کے متعلق تصریح ہے لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی
الالباب پس فوج طالوت کے قصہ سے ہمکو یہ عبرت ملتی ہے کہ جناب محمد الرسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو قرآن مجید کی ماتحتی مین مجاہدہ نفس اور
مقابلہ کفار کا کام سپرد کیا کہ دیکھو جو کچھہ تمکو قرآن حکم دے۔ اسی پر چلنا ورنہ
تم بیکار ہو جاوٴگے۔ کیونکہ موٴمن کو دنیا مین بہت دشمنون سے مقابلہ درپیش رہتا ہے
خواہ وہ شیطان ہو خواہ کفار خواہ نفس۔ لیکن اس راستہ مین زینت دنیاوی
کی نہرین بھی بہت ہین۔ سپہ سالار نے کہدیا کہ کلوا واشربوا ولا تسرفوا
یعنی اسباب دنیا سے بقدر ضرورت مختصر تعلق رکھنا۔ اسی مین تمہاری نجات
وفلاح ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی مین بھی اسیکا نمونہ
موجود ہے کہ ہرچہ گیرید مختصر گیرید کن فی الدنیا کانک غریب او کعابر

سبیل دیکھو انما اموالکم واولادکم فتنۃ ؕ پر ہمیشہ خیال رکھنا کہ یہ جملہ اسباب دنیا تمھارے امتحان اور جانچ کے لیئے ہیں۔ اسی میں منہمک مست ہو جانا بلکہ زندگی کے اکثر اوقات کو یاد الٰہی میں بسر کرنا۔ کیونکہ تمھارے تخلیق کی علت غائی یہی ہے۔ ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون ہاں بطور من امر فتہ بیدہ کے تم کو ضروریات معیشت بھی حاصل کرنا ہے لیکن سپاہی صاحب دنیا کے آرائشوں میں ایسے محو ہوئے کہ سپہ سالار کا حکم بالکل بھلادیا۔ اور ہمہ تن انہیں دنیاوی نہروں میں غوطہ زن ہو گئے جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن سے مقابلہ تو کیا خاک کرتے بلکہ اب تو انکو دوست اور دشمن کی بھی تمیز باقی نہیں رہی اور جس سبیل سے دنیا ملجاوے۔ اسی کو کامیابی سمجھنے لگے۔ ان کو اس کا خیال بھی نہیں آتا ہے کہ سب دنیا کو میرا دشمن بنایا گیا ہے۔ اما الانسان اذا ما ابتلاہ ربہ فاکرمہ ونعمہ فیقول ربی اکرمن دولت خواہ ظلم سے جمع ہو خواہ رشوت سے خواہ سود سے یا غیر مشروع تجارتوں سے خواہ مکروفریب سے بس دولت ہاتھ آئی اور اپنے کو کامیاب وخوش نصیب سمجھنے لگے۔ غرباء و مستحقین کے حقوق کا خیال نہیں مصارف مشروعہ کی پروا نہیں بلکہ صرف زبان پر شکر خدا بھی کم آتا ہے سے

اب تو آرام سے گذرتی ہے   عاقبت کی خبر خدا جانے

قرآن نے بتایا ہے کہ واٰتوحقہ یوم حصادہ یعنی اپنے کھیت کے پیداوار سے کٹنی کے دن ہی غریبوں کے حقوق نکال دو۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہندوستان ایسی پیداوار جگہ میں کتنے کاشتکار ایسے بھی ہیں جو عشر کے نام سے بھی واقف نہیں نہیں کہ عشر ہے کیا شئے اور واقف کاروں میں بھی زیادہ لوگ ایسے ہیں جو کہ حقوق غرباء ہضم کرنے کے لیئے ہندوستان کی سب اراضی

کو غیر عشری بتاتے ہیں گویا پیداوار زمین میں بجز ان کے یا انکے ملازموں کے اور
کسی کا کوئی حق نہیں ہے۔ اب غریب سپاہی کا حال سنیئے کہ جس کو دنیا میسر نہیں
آئی وہ رات دن نقدان دنیا کے غم میں ایسے مشغول ہیں کہ یاد خدا کی نوبت انکو آتی
نہیں۔ بقول سعدی۔ گہ اندر دولتی مغرور و غافل + گہ اندر تنگدستی خستہ وریش
چو در سرا و ضرا و حالتست اینست۔ ندانم کے بحق پردازی از خویش۔ الغرض تھے
تو خدا پرست اور ہو گئے ہوا پرست اور یہی ہوا پرستی شغل زندگی ہوئی۔ معبود حقیقی
سے قلوب غافل ہو گئے اور اسیکا نام شرک خفی ہے۔ افرایت من اتخذ
الٰہہ ھواہ۔ اور بباعث اس ہوا پرستی کے ایمان رخصت ہو گیا۔ دفتر سے نام
کٹ گیا۔ لیکن اس کو خبر بھی نہ ہوئی کہ ہم بالکل بیکار اور نکمے ہو گئے ہیں تاکہ توبہ
و استغفار سے تلافی مافات کر لیتا۔ القصہ اسی لاعلمی میں یہاں سے روانہ ہو گئے
عاقبت میں آنکھ کھلی تو نامۂ اعمال جرائم سے بھرا ہے۔ رشوت۔ ظلم۔ سود۔ تکبر۔
غرور۔ غیبت۔ ترک عشر ترک زکوۃ سب کچھ موجود ہے۔ مگر وہاں علاج معالجہ
کا سامان کہاں اللہ نے فرمایا تھا کہ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی کہ
پہلے میرے بندوں میں داخل ہو جاؤ۔ تب میری جنت میں جاؤ۔ عمر بھر تو نفس
پرستی کی اب جنت کا استحقاق کہاں رہا۔ اسی دہشت اور پریشانی میں شفیع محشر
صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا خیال آیا۔ اُمید کی جھلک بھی نظر آنے لگی۔ کیونکہ
ہزاروں لاکھوں کو آپ دوزخ سے نکلوا رہے ہیں چلو اس دستگیر سے اپنا درد
بیان کریں۔ اسی اُمید پر سرکار کے حوض کوثر پر پہونچے۔ فرشتوں نے دھکا
دیکر نکال دیا کہ نکلو تمہارا حصہ یہاں نہیں ہے۔ حضور ارشاد فرما دینگے کہ یہ
لوگ تو میری اُمت کے نظر آتے ہیں۔ یہ کیوں نکالے جاتے ہیں۔ ملائکہ عرض
کرینگے کہ حضور ان کمبختوں نے بعد آپ کے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ بدعات میں

پڑ گئے تھے۔ خدا پرستی کے عوض خواہش پرستی کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمادیں گے سحقا سحقا لمن غیر بعدی۔ یعنی خرابی ہی ایسے لوگوں کی جنھوں نے میرے بعد دین کو بدلا تھا۔ مسلمانو غور تو کرو کہ حضور کے شفاعت پر اُمید منحصر ٹھہری لیکن جب وہ رحمۃ اللعالمین یہ استغاثہ فرمادیں گے کہ وقال الرسول یا رب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا ہ فرقان۔ پھر کہاں ٹھکانہ ہی اور کیا جواب۔ ہاں حسرت کے ساتھ وہاں پتہ چلیگا کہ ارے قرآن نے تو کہدیا تھا کہ جو اس نہر کا پانی خوب جی بھر کر پئے گا۔ فلیس منی یعنی وہ میری جماعت سے باہر ہو جائیگا۔ ہم تو دنیا میں خوب مبتلا تھے۔ اب حسب منشاء فلیس منی کے اسلام سے نکل چکے ہیں حضور کی شفاعت تو اپنی امت عاصی کے لیئے ہے نہ کہ مشرکین کے لیئے اور جبکہ نامۂ اعمال میں شرک خفی کے صدہا جرائم موجود ہیں تو اب امید سفارش کیا ہی۔ جیسے غیر امت محمدی دنیا میں قرآن سے فائدہ نہیں اُٹھاتی تھی اسی طرح دنیا میں ہمنے بھی تو اسکو سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ خلاصہ یہ ہی کہ ہوا پرستی کی انتہا کبھی لامذہبی ہو جاتی ہی اس لیئے ہر مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی حالت کو ہمیشہ غور سے دیکھتا رہے کہ کسی سامان دنیا من اغترف غرفتہ بیدہ کی حد سے بڑھا تو نہیں ہے۔ اگر شاید ایسا ہو گیا ہو تو اسکو قے کر ڈالے اور یہی توبہ استغفار وادا حقوق اسکا تنقیہ اور علاج ہے اور اس قصہ کا نتیجہ یہی ہے کہ ہر مسلمان اپنے کو قرآن سے آشنا بنے لگاؤ ہر گز نہ ناد ے کہ وہ ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا کا مصداق ہو سکے۔ ہاں دنیا اچھے لوگوں سے خالی بھی نہیں ہے۔ الٰہی انسانوں میں ایسے آدمی بھی ہیں کہ جو ان اسباب دنیا سے بقدر ضرورت اپنا حق سمجھتے ہیں اور وہی حضرات الا قلیلا کے مصداق ہیں جن کے حق میں ارشاد ہے لاخوف علیھم ولا

ہم یہ کہتے ہیں ان لوگوں کو اگر اسباب دنیا زیادہ ہوں بھی تو کیا مضر ہے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کو غفلت تو ہو نہیں سکتی ہے اپنا حق اسمیں بہت کم جانتے ہیں باقی اللہ کی مخلوق کا حق جانکر ان کی ضرورتوں میں صرف کر دیتے ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بودن
نہ قماشش ونقرہ وفرزند وزن

قال عز اسمہ لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی الخ

(سورہ بقر) یعنی دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے کیونکہ اللہ نے ہدایت کو ظاہر کر دیا ہے جس کا جی چاہے بطور رغبت واختیار کے اسلام میں داخل ہو لیکن مخالفوں نے آجکل ایک شور مچا رکھا ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا ہے۔ جسکا صاف جواب اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ اشاعت اسلام کیلئے شمشیر زنی نہیں چاہیئے اور نہ بزور تلوار مسلمان بنانے کا حکم شریعت نے دیا ہے۔ بلکہ اسلام اپنی خوبیوں کی وجہ سے عالمگیر ہو گیا۔ یہ تو ایک ثبوت قرآن سے تھا لیکن ایک حدیث سے بھی منکرین محجوب اعتراض کرتے ہیں۔ اور اشاعت اسلام کا سبب تیغ افگنی بتلاتے ہیں لہذا مناسب سمجھتا ہوں کہ اس حدیث کو بھی اسجگہ نقل کر کے مخالفوں کی جہالت کھول دوں۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم امرت ان اقاتل الناس حتی یقو لوا لا الہ الا اللہ۔ حقیقت حال تو یوں ہے کہ اس حدیث سے اسلام پر کوئی اعتراض عائد نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ خوبی اسلام کی اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے اگر معترض کو علم عربی سے کچھ لگاؤ ہوتا تو ایسی عمدہ حدیث کو اعتراضاً نہیں پیش کرتا سنئے الفاظ حدیث کے یہ ہیں امرت ان اقاتل الناس اقاتل باب مفاعلہ کا صیغہ ہے اور باب مفاعلہ کی خاصیت مشارکت ہے یعنی فاعل اور مفعول دونوں من وجہ فاعل اور من وجہ مفعول ہوں۔ جسکا مطلب یہ ہوا کہ جو کوئی تمسے

لڑے اس سے لڑو لیکن اگر ایسا موقعہ آجاوے کہ تمھارا دشمن عین میدان جنگ میں بھی لا الہ الا اللہ کہہ لے تو باوجودیکہ تمھارا نفس اسکی سابقہ شرارتوں کے باعث متقاضی انتقام ہو تب بھی بوجہ اس ایمان کے تم اس سے لڑائی فوراً چھوڑ دو اور اس کے ایمان کی قدر کرو۔ کیونکہ اب وہ تمھارا بھائی ہے۔ کیونکہ جب اس حدیث میں لفظ حتی موجود ہے۔ اور حتی کا استعمال کلام عرب میں انتہا، غایت کے لیئے ہوتا ہی۔ توگویا اس حدیث میں لڑائی کی ابتدا، اور انتہا، دونوں بیان ہوئی یعنے لڑنے والوں سے لڑو لیکن دشمن بھی جب ایمان لے آوے تو فوراً لڑائی موقوف کردو۔ اور اسکی پہلی خطا کو معاف کردو۔ کیسی مفید اور معنی خیز حدیث کو دشمنوں نے اعتراضاً پیش کیا ہی۔ ہاں اگر اس حدیث میں بجائے اقاتل کے لفظ اقتل ہوتا تو البتہ کچھہ گنجائش اعتراض کی نکل بھی سکتی تھی مگر اس حدیث میں تو صرف و نحو پڑھنے والے طلباء کو بھی شک و شبہہ پیدا نہیں ہو سکتا ہی۔ لیکن جہالت کا بُرا ہو جس سے انسان کو ذلت ہوتی ہے۔ اسلام میں زبردستی بیشک نہیں ہی۔ بلکہ

درِ فیض محمد وا ہے آئے جس کا جی چاہے + نہ آئے آتش دوزخ میں جا جسکا جی چاہے

چو نشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطا ست + سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

قال عزاسمہ وما تنفقوا من خیر یوف الیکم وانتم لا تظلمون (سورہ بقر) اس آیتہ میں خدا نے انفاق فی سبیل اللہ کے متعلق جملہ لوازمات کو بیان فرمایا ہی مستحقین بشارت کو بشارت دیگئی ہے۔ اور مستحقین وعید کا وعید بھی

انفاق فی سبیل اللہ

بیان کیا گیا ہی۔ دیکھو پہلے یہ بات بتائی گئی کہ لا تیمموا الخبیث منہ تنفقون یعنی خدا کی راہ میں ناقص اور خراب مال مت خرچ کرو۔ بلکہ عمدہ اور بہتر مال راہِ خدا میں دو۔ جو حضرات نہایت خراب اور ردّی غلّہ فقرا، کو دیدیتے ہیں جسے وہ خود کھانا پسند نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اپنے حقوق میں رعایا سے بالعوض جید غلّہ کے

اسس خراب غلہ لینا بھی گوارہ نہیں ہے ان کو اس آیت سے عبرت حاصل کرنا
چاہیئے۔ پھر یہ فرمایا کہ الشیطان یعدکم الفقر یعنی راہِ خدا میں خرچ کرنے سے ایسا
خیال مت کرو کہ تم خود اس فعل سے غریب ہو جاؤ گے۔ بلکہ یہ وسوسہ شیطانی ہے
علاوہ اس کے سب مال و متاع تو راہِ خدا میں خرچ کر دینے کا شریعت نے حکم بھی نہیں دیا
ہے۔ بلکہ فرائض و واجبات کے یہی چند عنوان بتائے ہیں زکوۃ۔ عشر۔ صدقہ فطر
قربانی۔ پھر دوسری بات جو بتائی گئی وہ یہ ہے کہ یا ایہا الذین آمنوا لا تبطلوا
صدقاتکم بالمن والاذی یعنی اے ایمان والو اپنے نیکیوں کا ثواب ایذا
پہونچا کر یا احسان جتا کر باطل مت کر دیا کرو۔ بعضوں کی یہ عادت ہوتی کہ اگر حسبۃً للہ
کسی محتاج مسکین کو کچھ دیا تو اس سے خدمت یا ثنا خوانی کی آس لگائے بیٹھے
رہتے ہیں۔ اگر اس مسکین نے خوب تعریف کی اور کچھ جسمانی خدمت بھی بجا لایا تب
تو فہو المراد۔ ورنہ جب میر صاحب خفا ہوئے تو لگے ہر شخص سے بیان کرنے کہ
فلاں بڑا کمینہ ہے ہم نے اتنے موقعہ پر اسکو مالی امداد پہونچائی ہے لیکن وہ احسان
فراموش ہو گیا۔ بعض دولتمند تو اسقدر حد سے بڑھتے ہیں کہ مردہ کی بھی بدگوئی سے
نہیں چوکتے کہہ گذرتے ہیں کہ تیرا باپ بھی احسان فراموش تھا۔ یا یوں کہ ہم نے
فلاں آدمی کے ساتھ اسقدر سلوک کیا لیکن وہ مرتے دم تک مقر احسان ممنون
نہیں ہوا۔ حالانکہ اذکروا محاسن موتاکم کی ہمکو شریعت نے تعلیم دی ہے
بہر کیف ایسے خرچ کرنیوالوں کو یہ بات بتائی گئی کہ قول معروف خیر من
صدقۃ یتبعہا اذی یعنی ایسی داد و دہش سے تو اچھا یہ ہے کہ فقیر کو
نرمی کے ساتھ ٹال دیا کرو۔ اور شیریں لہجہ میں اس سے معذرت کر دینا اچھا ہے
پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ غریب کو دبا دیں کیوں جبکہ اسکا نفع تو خود منفق
کو آخرت میں ملنے والا ہے بلکہ شکر خدائے کن کہ موفق شدی بخیر

زانعام وفضل اور نہ معطل گذاشتت + پھر یہ ارشاد ہوا کہ ما انفقتم من
نفقتہ او نذرتم من نذر فان اللہ یعلمہ وما للظالمین من
انصار یعنی ان امورات کو جان لینے کے بعد بھی تمنے جو کچھ میری راہ میں خرچ
کیا ہی اسکو ہم خود جانتے ہیں اگر تم نے میری مرضی اور خوشنودگی کے لیئے خرچ کیا ہی
تو یوف الیکم وانتم لا تظلمون یعنی ہم اسکا پورا پورا بدلا تم کو دیدینگے
اور تمھاری حق تلفی نہیں کیجاویگی اور اگر تم نے محض دکھلاوے کو یا قہراً جبراً خرچ کیا
ہی جیسا کہ اہل نفاق کا شیوہ ہی کہ لا ینفقون الا وھم کارھون تو جان لو
کہ اللہ غنی اور بے نیاز ہی اسکو ظالموں کی پرواہ نہیں ہی اور جو خرچ راہ خدا ان خوبیوں
سے خالی ہوگا۔ وہ بے سود ہی اور جو حضرات ایسا کرتے ہیں وہ عند اللہ ظالم ہیں
جسکا آخرت میں کوئی مددگار نہیں ہی۔ وما للظالمین من انصار۔ مسلمانو
خوب غور سے ان آیتوں کا مطلب سمجھو اور قرآن کے اصول کو انفاق فی سبیل اللہ
میں ہمیشہ ملحوظ رکھو تاکہ تمھارا صدقہ خیرات زکوۃ عشر قربانی فطرہ غربا پروری
مہمان نوازی تمھارے لیئے آخرت میں مفید ہو کیونکہ پھر وعدہ بھی ہی کہ ایک کا
سات سو تک بلکہ (واللہ یضاعف لمن یشاء بغیر حساب) بہت زیادہ اجر
ہم دینگے۔ کیونکہ خدا کے یہاں تو صرف خلوص کی قدر و قیمت ہے۔

قال عز اسمہ وان تبدوا ما فی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم
بہ اللہ (سورہ بقر) یعنی جو کچھ تمھارے دلوں میں ہی خواہ اسکو ظاہر کرو یا نکرو ہم
اسکا حساب کرینگے۔ اب شبہ یہ ہوتا ہی کہ وسوسہ کو ٹالنا تو طاقت بشری سے
باہر ہے۔ اور جب اس پر محاسبہ ہوگا تو یہ تکلیف بالا لطاق ہی۔ عام طور پر اسکا
جواب یہ ہے کہ یہ آیت لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا سے منسوخ ہی لیکن
جو لوگ نسخ کے قائل نہیں ہیں انکا محققانہ جواب یہ ہے کہ خدا نے یحاسبکم فرمایا ہے

اور حسیب و محاسب کے معنی عالم اور خبیر بھی ہیں۔ اب مطلب آیۃ کا یہ ہوا کہ تم وسوسہ کو ظاہر کرو یا نہ کرو۔ اللہ اسکو جانتا ہی۔ دوسری جگہ اسکی تصریح بھی ہے یعلم ما توسوس بہ نفسہ ہاں اگر بجائے یحاسبکم کے یجازیکم ہوتا تو البتہ تاویل کی ضرورت پیش آتی۔ علاوہ اس کے نسخ تو احکام میں ہوتا ہی نہ کہ اخبار میں پس یحاسبکم اللہ جو کہ از قبیل اخبار ہی اسکا ناسخ لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا کیونکر ہوگا۔ ہاں لا یکلف اللہ کا مطلب سنو کہ اگر یہ جملہ خدا کا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جب تم سب اطاعت کروگے اور بطور سہو و نسیان کے نہ اگر کوئی غلطی تمسے ہوجائیگی تو ہم بھول چوک کو معاف کر دینگے۔ کیونکہ اللہ تکلیف ما لا یطاق نہیں دیتا ہی۔ اور اگر یہ جملہ مومنین کا ہے تو مطلب یوں ہوا کہ مسلمانوں نے یہ کہا کہ سمعنا و اطعنا یعنی ہملوگ کیونکر نہ خدا کی اطاعت کریں۔ جبکہ میرا رب تکلیف مالا یطاق ہمکو نہیں دیتا ہی۔

قال عز اسمہ و ان یاتوکم اساریٰ تفادوھم الایۃ (سورۂ بقر) واعظ بے عمل
یعنی اے بنی اسرائیل اگر تمھارے پاس قیدی آتے ہیں تو تم انکو فدیہ دیکر چھڑا لاتے ہو۔ حالانکہ تم کو انکا نکالنا بھی حرام تھا۔ کیا بعض کتاب پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو۔ جو ایسا کرتا ہی اسکو دنیا میں بھی ذلت ہی اور آخرت میں سخت عذاب ہوگا۔ جس آیت کا یہ ترجمہ مینے عرض کیا اسمیں صرف بنی اسرائیل کی تخصیص نہیں ہی۔ بلکہ ہر ایسے عالم کے لیئے سخت عبرت ہی کہ جو دوسرونکو نصیحت کرتا ہی اور بدکاری سے غیروں کو روکتا ہے۔ لیکن خود اپنی اصلاح نہیں کرتا ہی۔ کیونکہ جس طرح علما پر امر بالمعروف فرض ہی اسی طور سے عمل بھی فرض ہی۔ نگر مسئلہ دارم ز دانشمند مجلس باز پرس + توبہ فرمایان چرا خود توبہ کمتر میکنند + ہر یکے ناصح برائے دیگراں + ناصح خود یافتم کم در جہاں + ایسے مولوی یومنون ببعض الکتاب و یکفرون

ببعض کے مصداق ہیں۔ اور ایسے لوگوں کی سزا دونوں جہان میں موجود ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آجکل اکثر مولویوں کا وعظ بے اثر رہتا ہے ؎ ترک دنیا بمردم آموزند + خویشتن سیم و غلّہ اندوزند + پس خفتہ را خفتہ کے کند بیدار۔ البتہ جو مولوی عامل بالشرع اور خدا ترس ہیں ان کی ہدایت و تلقین سے عوام ضرور متاثر اور تائب ہوتے ہیں۔

قال عز اسمہ ان اللہ اصطفیٰ آدم و نوحاً و آل ابراھیم و آل عمران علی العالمین (سورہ آل عمران) خدا نے حضرت آدم علیہ السلام کو برگزیدہ بنا کر نسلاً بعد نسلٍ کمالات قوی روحانیہ و جسمانیہ کو بہترین اولاد میں انکے منتقل کرتا گیا۔ یہاں تک کہ جملہ خوبیاں اور کمالات ایک ذات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے موجود ہو گئے۔ حضور کا قوی روحانیہ اور جسمانیہ دونوں اور انسانوں سے اعلیٰ اور افضل ہے۔

مثلاً قوت باصرہ کا یہ حال تھا کہ حضور سامنے سے بھی دیکھتے تھے۔ اور پس پشت کی چیز بھی آپکو دکھائی دیتی تھی۔ قوت سامعہ کا یہ کمال کہ جہنم میں جو پتھر ڈالا گیا اس کی آواز بھی آپ نے سنی۔ قوۃ ذائقہ کا یہ کرشمہ ادراک کے مسموم بکری کے گوشت کو آپ نے بتلا دیا۔ قوت محرکہ کا یہ اعجاز کہ آپ آسمان پر تشریف لے گئے۔

قال عز اسمہ ان اللہ یبشرک بکلمۃ منہ اسمہ المسیح عیسیٰ بن مریم وجیھاً فی الدنیا والاخرۃ ومن المقربین ویکلم الناس فی المھد وکھلاً (آل عمران) اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حضرت مریم علیہا کو دو لبشارتیں حیرت انگیز پیشینگوئیوں کے ضمن میں متعلق حضرت مسیح کے دیگئیں تھیں۔ ایک یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بحالت شیر خوارگی بات کریں گے۔ اور دوسرے یہ کہ بحالت کہولت بولیں گے۔ اور بیشک بحالت شیر خوارگی آپ سے گفتگو

ویکلم الناس

صادر ہوئی یعنی انی عبد اللہ کہہ کر اپنی والدہ محترمہ کی عصمت آپ نے بیان کر دیا
اور فی الواقع طفل فی المہد کا بولنا اعجاز ہے۔ سن کہولت میں بات کرنا تو کوئی کمال
نہیں ہی ہر انسان بولتا ہی۔ پھر اسکو موقعہ امتنان میں ذکر کرنا اور حضرت مسیحؑ کی
خصوصیت قرار دینا کیا راز رکھتا ہی۔ سنو وہ خصوصیت یوں ہے کہ وقت رفع
کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر شریف ۳۳ برس چھ ماہ کی تھی جو کہ سن شباب
ہی۔ اور قرآن کی خبر اور پیشینگوئی سب سچی ہوا کرتی ہی۔ اب اگر موت مسیح کا عقیدہ صحیح ہو
تب تو یہ الزام عائد ہوتا ہے۔ کہ قرآن نے خبر دی تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام سن
کہولت میں کلام کریں گے۔ اب سن کہولت میں کلام تو درکنار آپ نے وہ سن بھی
نہیں پایا پس یہ بات یقیناً ثابت ہو گئی کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ ہیں۔ اور
آسمان سے اُتریں گے اور عمر کہولت پاویں گے اور اس عمر میں بھی لوگوں کو حکمت اور
معرفت کی بات بتائیں گے۔ اور حیات مسیح کے متعلق مفسرین نے اسی آیت کو نص
بتلایا ہے۔ اور بیشک جسطرح آپ کی ولادت غیر معہود ہی اسی لیئے قرآن نے جا بجا
آپ کو عیسیٰ بن مریم کہا ہے۔ حالانکہ قرآن میں کسی نبی کا تذکرہ بقید ابنیت بار بار
نہیں کہا گیا۔ مگر حضرت عیسیٰ کو اکثر مسیح بن مریم کہنے میں مصلحت یہ ہے کہ لوگ
حضرت مریم کی عصمت پر ایمان رکھیں اور اس محترمہ کے طرف بدگمانی نکریں اسی
طرح آپ کا آسمان پر تشریف لیجانا۔ اور وہاں سے پھر دوبارہ اس دنیا میں آنا اور
ایک عرصہ کے بعد پھر سن کہولت پانا کسقدر غیر معہود ہے لہذا قرآن نے بطور
پیشین گوئی کے اس امر عظیم الشان کی خبر دیدیا ہے۔ تاکہ مسلمان گمراہ نہوں۔

پس بالیقین مسیح موعود وہی مسیح بن مریم ہیں جو کہ مرفوع ہوئے ہیں،
کیونکہ مثیل مسیح کا عقیدہ نص کے سراسر خلاف ہے۔ اور وہی مسیح بن مریم جنھوں
نے کہ فی المہد کلام کیا تھا۔ مسیح موعود ہو کر دوبارہ آسمان سے تشریف لائینگے اور فی الکہولت

گفتگو کریں گے کیونکہ جب آیت کا ایک حصہ پورا ہو تو دوسرا حصہ بھی ضرور پورا ہوگا۔ اور احادیث سے بھی اسی عقیدہ کا ثبوت ملتا ہے! اور ممات مسیح کا عقیدہ ایک وسوسہ شیطانی ہے۔ بلکہ اصحاب دانش کے نزدیک اذ قال اللہ یا عیسیٰ انی متوفیک ورافعک الی ومطہرک من الذین کفروا سے رفع اور نزول ہر دو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ثابت ہے اس طرح پر کہ مفسرین کی ایک جماعت عبارت میں بلالحاظ تقدیم و تاخیر کے اسکا مطلب یوں بتلاتے ہیں کہ انی متوفیک یعنی ہم پوری کریں گے تمہاری زندگی کو اور تمہارے دشمنوں کو ہم تمہارے قتل پر قابو نہیں دیں گے! اور اس حفاظت کی صورت یہ ہوگی کہ ہم تمکو آسمان پر اُٹھا لینگے۔ اور ملائکہ کے ساتھ رکھیں گے۔ اور پھر تم کو دنیا میں اُتاریں گے اور بعض عبارت میں تقدیم و تاخیر کے قائل ہیں، وہ یوں مطلب بیان کرتے ہیں کہ رافعک الی یعنی اے عیسیٰ ہم تم کو زندہ آسمان پر اُٹھا لینگے اور دشمنوں سے تم کو محفوظ رکھیں گے۔ اور پھر تم کو دنیا میں اُتاریں گے! اور ایک کام ہم تم سے لیں گے! اور جب تم اپنی پوری عمر دنیاوی دنیا میں گذار لو گے تب تم کو فوت کریں گے بہر حال حیات مسیح اور نزول مسیح کے جملہ متقدمین بھی قائل ہیں۔ ہاں! مرزائیوں نے ایک مغالطہ عوام کو یہ دیا ہے کہ محی الدین عربی (جو کہ قدما محققین میں ہیں) بھی مثل مسیح کے معتقد تھے اور شیخ کی تفسیر سے اس عبارت کو بھی حجت میں پیش کیا کرتے ہیں۔ وجب نزول عیسیٰ علیہ السلام فی آخر الزمان متعلقہ ببدن اخر

تفسیر محی الدین عربی صفحہ ۱۶۵ یعنی شیخ بھی بزعم مرزائیوں کے نزول بجسدہ کے منکر تھے اسی لیئے بدن آخر لکھ گئے ہیں۔ لہٰذا مرزا صاحب مسیح موعود ہوئے ناظرین واضح ہو کہ اولاً تو شیخ اکبر کی یہ تصنیف محض باطنی رنگ میں ہے اور

صوفیانہ کلام ہی جس سے ظاہر شریعت میں کوئی حجت و دلیل نہیں ہو سکتی ہے
کیونکہ اس عبارت کی توجیہ اگر مطابق عقیدہ مرزائیوں کے کیجاوے تو اس سے
ثبوت تناسخ لازم آتا ہی۔ حالانکہ خود شیخ جمیع مسلمانوں کے طرح بطلان تناسخ
کے معتقد ہیں۔ لہذا یہ توجیہ القول بما لا یرضی بہ قائلہ کے تحت میں ہی دوسری
بات یہ ہی کہ اگر یہ تفسیر ان کے نزدیک معتبر اور واجب التسلیم ہے تو لازم ہی کہ
پوری کتاب کو مانیں۔ اسی کتاب کے صفحہ ۳۴۴ میں لکھتے ہیں کہ پھر زمانہ ظہور تجلی
نامہ کا ہوا۔ بذریعہ نبوت جناب محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ اور
نبوت آپ پر ختم کردیگئی۔ انتہی۔ اب مرزائی کیوں سلسلہ نبوت کو جاری مانتے ہیں
اس عقیدہ میں شیخ کی عبارت سے سند کیوں نہیں لیتے یؤمن ببعض ویکفر
ببعض اسی کو کہتے ہیں۔ اصل یہ ہی کہ شیخ اہل باطن تھے ان کا ہر کلام
ارباب ظاہر کے سمجھ میں آنا کچھ ضرور نہیں ہی۔ دیکھو جو شخص تناسخ کو باطل
مانتا ہو اور ختم نبوت کا عقیدہ رکھتا ہو ایسا شخص نزول بجسدہ کا کبھی منکر
ہو سکتا ہے؟ چنانچہ صفحہ ۲۴۲ میں وہ خود لکھتے ہیں:۔
کہ میری یہ تفسیر ایک تاویل ہے برعایت باطن کے ورنہ میرا اصل مطلب
ظاہری کا منکر نہیں ہوں لان الاقرار بظاہرہا واجب
میں شیخ کی اس عبارت کا مطلب عرض کرتا ہوں کہ وجوب نزول عیسیٰ
علیہ السلام فی آخر الزمان متعلقہ ببدن آخر۔ جبکہ اس عبارت میں
لفظ نزول موجود ہی تو یہ گمان کیونکر کیا جاتا ہی کہ شیخ نزول بجسدہ کے منکر تھے
اگر ایسا ہوتا تو بجائے لفظ نزول کے لفظ ظہور ہوتا۔ نزول کا تو مفہوم اس موقع
پر تو یہی ہی کہ بعینہ وہی شئے جو مرفوع ہوئی ہے نازل ہو۔ گرچہ معنی لغوی میں
یہ تخصیص نزول کے واسطے نہیں ہی لیکن اس مسئلہ میں نزول مخصوص ساتھ

معنی مذکورہ کے شرعاً ہے۔ چنانچہ بر بنا اس اصطلاح کے حدیثوں میں جہاں کہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کی خبر دیگئی ہے۔ وہاں لفظ نزول بولا گیا ہی۔ البتہ امام مہدی علیہ السلام کے متعلق لفظ ظہور بولا جاتا ہی۔ اس میں مغالطہ یہ ہے کہ ببدن میں باظرفیت کی قرار دیکر یوں دکھلایا جاتا ہی کہ ببدن آخر اے فی جسد آخر۔ پس انکا مطلب نکل آیا۔ حالانکہ لفظ بدن اسجگہ بفتح البار نہیں ہی اور نہ با ظرفیۃ کی ہی۔ بلکہ تلفظ اسکا ببدن بضم البار ہی اور با سببیہ ہی اس بنا پر شیخ کی عبارت کا مطلب واضح ہے کہ واجب ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ دنیا میں تشریف لانا اور وجہ وعلت نزول مسیح کی یہ ہے کہ تعلق آپکا ایک بُدنہ سے ہی۔ اور وہ بُدنہ دجّال ہی۔ چونکہ دجال کو ذبح کرنے کا کام مشیت آلہی نے حضرت مسیح کے سپرد کیا ہی پس اسی کو قتل کرنے کے لیئے آپ دوبارہ تشریف لاوینگے۔ اور اگر بدن بفتح البار پڑھا جاوے تب بھی مطلب ظاہر ہے کیونکہ عرب میں بدن کو معنی سن رسیدہ بھی لیتے ہیں۔ چنانچہ بولتے ہیں۔ رجل بادن۔ اے مسِن اس بنا پر مطلب یہ ہوگا کہ وجہ نزول مسیح علیہ السلام کی یہ ہی کہ وہ پرانا سن رسیدہ رہزن جسکا کہ نام دجال ہے۔ اس کے ازالہ اور دفعیہ کے لیئے آپ نزول فرماوینگے۔ اور حدیثوں سے اس کا پتہ ملتا ہی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے قبل دجال کی پیدائش ہوچکی ہی لیکن وہ مقید ہی۔ ہاں خروج اسکا آخر زمانہ میں ہوگا۔ اسی لیئے وہ سب سے پچھلا اور آخر مفتری ہی۔ ورنہ یوں تو دنیا میں دعوئ خدائی کا پہلے بھی لوگوں نے کیا ہے جس کی مختلف طرح سے سزائیں ہوئیں۔ کوئی دریا میں ڈبویا گیا۔ کسی کو مچھر کے ذریعہ ہلاک کیا گیا۔ کوئی اور عنوان سے سزایاب ہوا۔ مگر یہ دجال جوکہ اس امر میں سب سے کہنہ تو ہی ہے اور ظہور میں سب سے آخر اسکا مقتول ہونا حضرت مسیح

متعلق ہے۔ لہذا آپ تشریف لاوینگے اور دجّال کے معمر اور سن رسیدہ ہونے میں
کسی کو کلام ہے۔ واللہ اعلم۔

قال عز اسمہ ان الذین کفروا بعد ایمانھم ثم ازدادوا کفراً
لن تقبل توبتھم واولٓئک ھم الضالون (سورہ آل عمران) پہلی آیت سے
یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرتد کی توبہ مقبول ہے اور اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرتد
کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ گرچہ بظاہر ان دونوں آیتوں میں تعارض معلوم ہوتا
ہے لیکن درحقیقت تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ آیت اولیٰ کا مطلب یہ ہے کہ اگر
معاذ اللہ کوئی شخص ایک مرتبہ مرتد ہوا اور اس نے توبہ کی۔ اور اس نے عقائد
کی اصلاح کرلی تو اس کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ اور اگر دوسری مرتبہ پھر وہی شخص
مرتد ہو گیا تو اب دوبارہ ارتداد کے بعد توبہ قبول نہ ہوگی۔ اور پہلی توبہ بھی اسکے
حق میں کالعدم ہے۔

قال عز اسمہ وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ ۱۵
سبیلا ط (سورہ آل عمران) تکلیفات شرعیہ کی دو قسمیں ہیں! ایک وہ کہ جس کی
اصلیت عقل میں آتی ہو اور تفصیل اسکی عقل میں نہیں سماتی ہو۔ مثلاً نماز
روزہ اور بعض وہ ہے کہ جس کی اصلیت اور کیفیت دونوں کے سمجھنے سے عقل
قاصر ہو۔ جیسے حج۔ پس حج کا بجالانا کمال عبودیت اور انقیاد پر دلالت کرتا ہے
گرچہ اس کے بعض فوائد لوگوں نے بیان کئے ہیں کہ عمر بھر میں ایک مرتبہ مختلف
ممالک کے مسلمانوں سے تبادلۂ خیالات کا وسیلہ ہے۔ ایک کو دوسرے کی حالت
سے خبرداری کا آسان ذریعہ۔ فوائد سفر کا حصول۔ طریق تجارت کا اخذ و تجربہ
وغیرہ وغیرہ۔ میں بھی اس کو تسلیم کرتا ہوں کہ اس قسم کے فوائد حج کے ضمن میں
پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس عبادت میں کیا راز ہے وہاں تک عقل کی رسائی

مشکل ہی محسوسات ہی میں تم غور کرو کہ انسان کی معرفت اور امتیاز چہرہ سے ہے
باوجودیکہ انسان کی آنکھیں تندرست ہوتی ہیں اور دور دور تک دیکھا کرتی ہیں
لیکن زید خود اپنا چہرہ آپ نہیں دیکھ سکتا ہے۔ حالانکہ وہ جسم کا ایسا ممتاز اور
نمایاں حصہ ہے کہ اُسی کو دیکھکر زید اور عمر میں فرق کیا جاتا ہے۔ بلکہ زید اپنا چہرہ
دیکھنے میں آئینہ کا محتاج ہوتا ہے اور جب آئینہ کی امداد سے اپنے کو دیکھنا
چاہتا ہے تو دیکھتا ہے جب محسوسات کے ادراک میں بھی میری کمزوری ثابت
ہے تو غیر مرئیات کے ادراک میں بھی ہم آلات کے محتاج ضرور ہونگے اسی بنا پر
اہل دانش یہ کہتے ہیں کہ وہاں جانے سے حاجی کو اپنے ایمان کی شکل نظر
آجاتی ہے۔ حجر اسود گویا ایک آئینہ یا کسوٹی ہے ایمان کے جانچنے کے لئے۔ شاید
یہی وجہ ہے کہ بعد واپسی حج کے بعض لوگ خدا پرست اور متقی ہوجاتے ہیں اور
بعضوں کا فسق و فجور بڑھجاتا ہے کیونکہ اب حاجی مستور الحال نہیں رہتا ہے لہذا
عمر بھر میں ایک مرتبہ یہ عبادت ادا پر فرض ہے۔ غرباء اس سے بری ہیں۔ اور
بعضوں کی رائے حج کے متعلق یہ ہے کہ جس نے جملہ آداب ظاہری اور باطنی کی
رعایت کے ساتھ عاشقانہ احرام باندھ کر حج کیا ہے اسکا راز وہی جانتا ہے یہہ
ایک وجدانی چیز ہے بیانی نہیں ہے۔ بلکہ کسی رادریں بزم ساغر دہند کہ داروئے
بیہوشیس در دہند + ہاں مولانا کے اس شعر میں کچھہ اشارہ ان اسرار کا پایا جاتا
ہے ؎ حج زیارت کردن خانہ بود + حج رب البیت مردانہ بود +

قال عزاسمہ یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ ج فاما الذین
اسودت وجوھھم اکفرتم بعد ایمانکم فذوقوا العذاب
بما کنتم تکفرون ہ (آل عمران) روسیاہوں سے فرشتے یہ کہینگے کہ کیا
تمنے بعد ایمان کے کفر کیا تھا۔ بظاہر ہر کافر مرتا نہیں ہے اور یہ جملہ آخر میں سبب کفار

کو کہا جائیگا۔ جواب اسکا یہ ہی کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ
عہد الست کے موقعہ پر سب نے ایمان لایا تھا۔ اس لیئے جن لوگوں نے دنیا میں
کفر کیا ہی۔ وہ سب کے سب کافر بعد الایمان ہیں۔ بموجب اس آیت کے کفار ومشرکین
کا مرتد ہونا تو معلوم ہو گیا۔ اور یہ سب کو معلوم ہے کہ مرتد کا عمل حبط ہو جاتا ہی۔ مگر
میرے ایک ہمعصر دوست اس امر کے قائل ہیں کہ کفار ومشرکین حتیٰ کہ فرعون و
نمرود وشداد وغیرہ بھی ایک عرصہ دراز کے بعد قعر جہنم سے نکال دیئے جائینگے
بلکہ ان کی کتاب میں یہ جملہ موجود ہی کہ شرک بھی ایک جرم ایسا ہے جو قابلیت جلنے
کی رکھتا ہی اور مشرکین کا شرک جب جل جائیگا۔ تب وہ لوگ عذاب سے نجات
پا جاوینگے۔ خواہ اس تنقیہ میں کتنی مدت درکار ہو مگر قابل تنقیہ یہ قصور بھی
ہی۔ اور کسی وقت انکو عہد الست کے ایمان کا فائدہ ضرور ملیگا۔ میرے دوست
کا یہ عقیدہ بربنا رحمت واسعہ خداوندی کے پیدا ہوا ہی۔ لیکن میں کہتا ہونکہ
عہد الست کے ایمان کا نافع ہونا مخالف عقل ہی۔ مثلاً کوئی رعیت شاہی ابتداء
میں بادشاہ کی سلطنت اور شاہی کا اقرار کرچکا ہی۔ لیکن پھر وہ باغی ہو گیا
اور اسی بغاوت پر قائم رہا لیکن بادشاہ باوجود قدرت اور اختیار کے بھی اسکو
سزا موت یا حبس دوام کی نہ دے۔ محض اس بناء پر کہ ایک وقت میں تو اس نے
مجھکو بادشاہ کہا تھا۔ یا مثلاً کسی نے جورو کو طلاق دیدیا۔ اور اس کے برس دو
برس بعد وہ شخص مر گیا اب وہ مطلقہ جورو بھی متروکہ میں وراثت کی دعویدار
ہو گئی۔ اور عرضی دعوے اسکا یہ ہی کہ گرچہ علاقہ زوجیت کو اس نے ہمیشہ قائم
نہیں رکھا تھا۔ مگر کسی وقت تو اس نے میرے حق میں زوجیت کا اقرار کیا
تھا۔ بتلاے کوئی عدالت اسکو جائز وارث قرار دیسکتی ہے۔ ہرگز نہیں علاوہ
اس کے جزا وسزا تو اس عالم تکلیف کے افعال پر مرتب ہوتا ہے۔ چونکہ یہی عالم

ایمان بالغیب کا ہی اور عہد الست میں عالم تکلیف کب تھا۔ اور اسی عقیدہ کی بنا
پر ان لوگوں نے خلود اور ابد کو بمعنی طول مکث قرار دیا ہی۔ ہاں رحمت خداوندی پر
خیال کرنے سے کچھ ایسا وہم ہو سکتا تھا لیکن سورۂ اعراف کی اس آیت سے
یہ مضمون بھی صاف ہو جاتا ہی ورحمتی وسعت کل شیٔ فسأکتبها للذین
یتقون ویؤتون الزکوۃ الآیۃ۔ یعنی دنیاوی رحمت میری گرچہ ہر شئی پر ہے
خواہ مومن ہو خواہ کافر سب کو خدا نے خلعت وجود عطا کیا اور سب کی حاجت
روائی کرتا ہی لیکن رحمت آخرت کی خاص ہی ان لوگوں کے واسطے جنمیں اتنی
صفتیں ہونگی۔ یعنی خدا سے ڈرتا ہو اور زکوۃ دیتا ہو اور قرآن پر اسکا ایمان ہو
اور نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتا ہو۔ الغرض نجات ابدی اور عذاب دائمی
سے چھٹکارا منحصر ہے نبی آخر الزماں جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی
اطاعت اور پیروی میں اور دوسری کوئی صورت فلاح و نجات کی نہیں ہی اس
آیت میں کیا شان محبوبیت جناب سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دکھائی گئی ہے
باوجودیکہ جمیع انسان بلا استثناء احد سے سبھوں نے عہد الست میں اقرار الوہیت
کیا تھا۔ لیکن دنیا میں آکر کفار منکر ہو گئے۔ مگر پھر بھی ان کو ایمان لانے کا موقعہ دیا
جاتا ہی اور تبلیغ کی جاتی ہی۔ اور یہ مرتد الوہیت محض اس جرم ارتداد کے وجہکر
واجب القتل نہیں ہوتا ہی۔ ہاں اگر کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان
لاکر ارتداد کیا تو یہ مرتد رسالت تین دن کی مہلت کے بعد واجب القتل ہو جاتا
ہے زیادہ وقت سوچنے کا ایسے مرتد کو نہیں دیا جاتا ہے۔ یعنی عذاب دنیا
بھی اس دوسرے مرتد پر جلدی آتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مرتدین رسالت
دونوں جہان میں مستحق سزا اور مرتدین وحدانیت دنیا میں آزاد ہیں۔ اسی لیئے
کسی اہل دل نے کہا ہی کہ با خدا بازی کن و با مصطفےٰ ہوشیار باش + پھر مرتدین

وحدانیت اور منکرین رسالت کی نجات ثابت کرنے کے درپے میرے دوست کیوں ہیں۔ میری سمجھ میں بات نہیں آتی ہے۔ حالانکہ جمہور مسلمان کفار اور مشرکین کا مخلد فی النار ہونا نص سے مانتے ہیں۔ یعنی خلود بمعنی لاالی انہایت۔ اس لئے جس کسی کو جمہور سے اس عقیدہ میں خلافت بھی ہو تو اس پر آشوب زمانہ میں مشار احتیاط یہی ہے کہ سکوت کرے اور ان مشرکین کی حمایت میں بہت حدیثوں کی بھی تکذیب لازم آجاتی ہے۔ المختصر بارگاہ رسالت سے انسان ہمیشہ ہوشیار رہے۔ کیونکہ اس دربار کی بے ادبی سے اعمال حبط ہوجاتے ہیں۔ خدا مجھ کو اور ہر مسلمانوں کو توفیق دے کہ رسول پاک کی محبت جان ومال سے زیادہ رکھیں۔ آمین!

قال عز اسمہ وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللّٰہ (سورہ آل عمران) اہلسنت اس بات پر متفق ہیں کہ جن امور میں آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم کو وحی آئی ہے اسمیں اُمت سے مشورہ لینے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ کام جسمیں وحی نہیں آئی ہو اسمیں حضور کو مشورہ کرنیکا حکم تھا۔ اس آیت سے یہ مسئلہ حل ہوجاتا ہے کہ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہنے کا نام توکل نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک جاہلانہ روش ہے۔ کیونکہ اگر اسباب ظاہری کی رعایت اس عالم اسباب میں کوئی چیز معتبر نہیں ہوتی تو آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم کیوں دیا جاتا اور جہاد وکوشش کی ضرورت کیوں پیش آتی۔ خدا خود بغیر ان اسباب ظاہری کے کام پورا کردیا کرتا۔ پس اصلی توکل یہ ہے کہ ان اسباب ظاہری کی رعایت ضرور کرے۔ لیکن کوشش وذرائع پر بھروسہ نہ رکھے بلکہ کامیابی کو اللّٰہ کے فضل پر موقوف جانے ع کارکن پس تکیہ برجبار کن۔

قال عز اسمہ بل احیاء عند ربھم یرزقون (آل عمران) چونکہ انسان جسم سے مغائر ہے لہذا محققین کے نزدیک شہدا فی الحال حیات روحانیہ

کے ساتھ زندہ ہیں جسطرح ضعف بدن مستلزم ضعف نفس کو نہیں ہی۔ دیکھو حالت نوم میں باوجود ضعف بدن کے قوی روحانی کیسے قوی ہو جاتے ہیں کہ کہاں کہاں کی خبریں لاتے ہیں! اسی طرح موت بدن بھی مستلزم موت نفس کو نہیں ہی۔ لہذا شہدار زندہ ہیں نہ باعتبار معنی عرفی کے کہ جس میں روح کا تعلق اس جسد عنصری کے ساتھ ہوتا ہی اسی لئے وہ فعل جسکا کہ صدور روح سے بذریعہ ان اعضار محسوسہ کے ہوتا ہی وہ علی العموم شہدار سے صادر نہیں ہوتا ہی۔ پس اس قسم کی زندگی کے مناسب جو غذا ہی وہ رزق بھی شہیدوں کو دیجاتی ہے۔ اور کفاروں کی برزخی زندگی چونکہ سراسر تکلیف ہی۔ لہذا اسکا وجود و عدم برابر سمجھو۔

قال عز اسمہ یا ایہا الذین امنوا لا تاکلوا الربوا اضعافا مضاعفة

سود خواری

واتقوا اللہ لعلکم تفلحون (آل عمران) اے ایمان والو! چند در چند سود مت کھاؤ اور ڈرو خدا سے تاکہ تم فلاح پاؤ۔ سود کی حرمت مسلمانوں کے یہاں اسقدر مشہور ہی کہ اس پر خامہ فرسائی کی حاجت نہیں تھی لیکن افسوس کہ اس پر آشوب زمانہ میں علمار سور نے سود خواری کے جواز کا فتویٰ دیدیا ہے اور اسی آیت سے ناواقفوں کو اس طریقے سے سمجھاتے ہیں کہ سود در سود کی حرمت قرآن میں ہی نہ مطلق سود کی مثلاً بینک وغیرہ کا سود تو محض قلیل منافع ہے جو مصداق ربوا و حرمت نہیں ہے اور دیکھو ذریعہ ترقی تجارت ہی اور فی زمانہ تجارت کا مدار بینک پر ہی کیونکہ بغیر بینک سے سروکار رکھے ہوے تجارت میں کامیابی دشوار ہی۔ چونکہ اسلام تجارت کی حمایت کرتا ہی۔ لہذا اس قسم کا سود حرام نہیں ہی۔ **اس مسئلہ میں میری مختصر گذارش یہ ہے** کہ جملہ اقسام سود خواہ قلیل ہو خواہ کثیر حرام ہے۔ آیت مذکورہ میں لفظ اضعافا مضاعفة قید احترازی نہیں ہی۔ بلکہ قید واقعی ہے چونکہ ایام جاہلیت میں عام

طور سے یہ مروج تھا کہ اگر مدیون وقت مقررہ پر اصل اور سود ادا نہ کرتا تھا تو اسکی
میعاد میں سود کو بڑھا کر توسیع کر دیا کرتے تھے! اور یہی طریقہ کثرت سے مروج تھا
اسی لیئے بلحاظ مطابقت واقعہ کے اضعافا مضاعفۃ کہا گیا اور قرآن پاک چونکہ
ایک آیت دوسرے کی تفسیر ہے اور آیت ما نحن فیہ میں جبکہ یہ احتمال تھا کہ شاید
سود در سود ہی ممنوع ہو پس اس احتمال کو بھی دوسری جگہ رفع کر دیا گیا بایطور کہ

یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ و ذروا ما بقی من الربوا ان کنتم مومنین

فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ و رسولہ وان تبتم فلکم رؤس

اموالکم۔ اے ایمان والو اگر تم سچے مومن ہو تو خدا سے ڈرو اور سود
چھوڑ دو اور اگر تم ترک سود نہیں کرتے ہو تو اللہ و رسول سے لڑائی پر آمادہ ہو جاؤ
اور اگر تم تائب ہوتے ہو تو صرف راس المال اپنا مدیون سے واپس لے لو اب
روس اموالکم سے صاف ظاہر ہو گیا کہ سود بمقدار قلیل بھی حرام ہے راس المال
سے جسقدر فاضل شئے مدیون سے حاصل کیجاوے وہ سود اور حرام ہے پھر
خدا نے سود خواروں کا حال پر وبال یوں بتایا کہ الذین یاکلون الربوا

لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطن من المس ذلک

بانھم قالوا انما البیع مثل الربوا و احل اللہ البیع و حرم الربوا فمن

جاءہ موعظۃ من ربہ فانتھی فلہ ما سلف و امرہ الی اللہ

ومن عاد فاولئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون یعنی سود
خوار مثل مصروع کے محشور ہو گا لیکن جو شخص کے لاعلمی میں سود کھاتا تھا
اور جسوقت اسکو خدا کا حکم معلوم ہو گیا اس نے اسیوقت سے چھوڑ دیا تو
معاملہ اس کا خدا کے ساتھ ہے لاعلمی کے فعل پر سزا دے یا اس مستعدی
اور فوری توبہ پر انعام لیکن جس نے سود کو حرام جان لینے کے بعد بھی کھایا ہو

وہ جہنمی ہے اور ہمیشہ اسمیں رہیگا۔ گرچہ خلود فی النار مسلمان فاسق کیلئے نہیں ہی۔ مگر اسکو مخلد فی النار کہا گیا غالباً اسکی یہ وجہ ہو کہ صغیرہ گناہ پر اصرار سے کبیرہ ہو جاتا ہی اور کبیرہ پر اصرار سے کفر ہوتا ہی۔ پس بار بار کی سود خواری سے گویا اس کے زوال ایمان کا احتمال ہی اور بے ایمان کی سزا دائمی جہنم ہی۔ جبکہ سود کے متعلق قرآن وحدیث میں کثرت سے وعید موجود ہی۔ پس خدا سے ڈرنیوالوں کی بھلائی اسمیں تھی کہ اس سے پرہیز کرتے۔ مگر اسکا کیا علاج ہی کہ اب تو مولوی سود خواری کا مشورہ دیتے ہیں اور سود کو ذریعہ ترقی بتاتے ہیں۔ حالانکہ ان کو لازم تھا کہ حسب منشاء تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان کے مسلمانوں کو نیک راہ بتاتے اور کار خیر میں تائید فرماتے لیکن افسوس جسکو سمجھا تھا مسیحا وہ ہلاکو نکلا، بلکہ اس زمانہ کے بعض مولویوں نے جواز سود موجودہ پھر بہت دلائل عقلی اور نقلی بھی لکھے ہیں۔ اور دلفریب توجیہات سے اس دام تزویر کو مزین بنایا ہی جن مضامین کو پڑھ کر تھوڑی معلومات اور قلیل تقوے والا مسلمان مروجہ زمانہ کے سود کو عموماً اور تجارتی سود کو خصوصاً حلال سمجھکر منطقی دام میں پھنس جاتا ہی۔ لہذا ان دلیلوں کی تردید میں کتاب کو طول دینا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ مجوزین سود سے کچھ غلط فہمی تو ہوئی نہیں ہی کہ جس کی اصلاح ہو سکے۔ بلکہ ہٹ دھرمی ہوئی ہی اور اسکا جواب غیر مفید۔ اور چونکہ میرے اس رسالہ کی غرض اردو داں و خدا ترس بھائیوں کو معلومات مذہبی کا افادہ ہی۔ لہذا میں قرآن پاک سے ایک قصہ یہاں پر نقل کرتا ہوں جس سے ہر طالب صادق کا قلب سود کے متعلق حلت یا حرمت کا فیصلہ خود کر لیگا۔

وہ قصہ یوں ہی کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے عہد میں دریا کے قریب ایک

۵ع سود کی حرمت اور سود خوار سے اللہ و رسول کی ناخوشی کا قیاس ان دو حدیثوں سے کیا جا سکتا ہی۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم درہم ربوا یاکلہ الرجل وہو یعلم اشد من ستۃ وثلثین زنیۃ رواہ احمد والدار قطنی۔ وروی البیہقی عن النبی صلعم الربوا سبعون جزأ ایسرہا ان ینکح الرجل امہ یعنی اگر کسی شقی نے اپنی ماں سے زنا کیا تو اسکی سزا کم ہے گر سود خوار خدا کے نزدیک ایسے کمبخت اور بے حیا زانی سے بھی زیادہ برا ہی اور مزید عقوبت کا سزاوار ہی۔ ۱۲ منہ

بستی آباد تھی۔ اور خلاف معمول بروز شنبہ اسمیں کثرت سے مچھلیاں نمودار
ہوا کرتی تھیں اور خدا نے اس بستی والوں کو سینچر کے دن شکار ماہی سے منع
کر دیا تھا۔ ایک عرصہ دراز تک تو انھوں نے حکم خداوندی کی بے چون و چرا پابندی
کی لیکن جب طمع غالب ہوئی تو شیطان اس جماعت کے مولوی اور عاقل کے
پاس پہونچا۔ اور وسوسہ اندازی شروع کی۔ المختصر یہ کہ وہاں کے عقلا اور علماء
نے تھوڑے عرصہ کے بعد ایک حیلہ یہ نکالا کہ دریا کے قریب چند چھوٹے چھوٹے
حوض بنوائے اور انکا سلسلہ دریا سے لگا دیا بروز شنبہ حسب معمول جب مچھلیاں
خوب نمودار ہوئیں اور ان حوضوں میں آکر جمع ہوگئیں۔ تو دریا کے طرف والا رستہ
بند کر دیا گیا۔ اور دوسرے دنوں میں شکار کیا کرتے تھے۔ جب وقت یہ ایجاد ہوئی تو
بعضوں کو اختلاف بھی تھا۔ اور خوف خدا بھی تھا لیکن زیادہ تر آدمی ایسے تھے
جو اس ایجاد کو بنگاہ تحسین دیکھتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔ الغرض ایک دو
پشت تک تو یہی دستور رہا کہ کوئی اہل علم اسکو حرام سمجھتا تھا اور کوئی حلال اس
عرصہ میں خدا نے بھی ڈھیل دیدی اور مجوزین کی جماعت نہایت فارغ البال
اور دولتمند ہوگئی ابتو یہ حضرات لگے ناز کرنے کہ عمہ زندگی زندہ ہے ہاتھ سے
جنت نہ گئی گذشتہ نسل والے لڑکوں نے جو اپنے کو غریب دیکھا اور صیاد دل
کو امیر تو انھوں نے بھی یہ حکم لگایا کہ معلوم میرے باپ دادا کیوں ایسے بیوقوف
تھے جو حرام حرام کہکر افلاس کی زندگی بھگت کر چلتے تھے اور ہملوگوں کو کنگال
اور ان امیروں کا دست نگر بنا کر چھوڑ گئے۔ ابتک میرے ہموطن اور ارکر آباؤ
اجداد بڑے عاقل اور ہوشیار تھے کہ کیسی ایک بات پیدا کی ہی کہ جسمیں حکم
خدا بھی نہیں ٹوٹتا ہی۔ اور ہاتھ سے دامن دولت بھی نہیں چھوٹتا ہی۔ لہذا بہتر
یہ ہے کہ اس اقبال مند قوم کی تقلید کیجا دے اور پہلا فتوی ردی کی ٹوکری

میں ڈالا جاوے گرے ہ سدا ایک ہی رخ نہیں ناو چلتی + چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی
چنانچہ آپ ان لوگوں نے بھی اب اس کام کو بیخوف وخطر کرنا شروع کیا اور برسوں
تک خوب دولت اس طریقہ سے جمع کرتے رہے یہاں تک کہ اب بعد والی نسل
کو اس کی حرمت کی جانب سے جب پوری لاپروائی ہوگئی تو ایک دن غیرت الٰہی
کا تقاضا ہوا اور وہ قوم بشکل بندر مسخ کر دیگئی۔ گرچہ اسمیں شک نہیں کہ ایک
عرصہ تک اُس قوم نے عیش کیا اور اپنے اعمال کی کوئی سزا نہیں پائی۔ بلکہ
دنیاوی ترقی بہت ہوئی جو کہ ان کے گمان میں خدا کے فضل کی خاص علامت
سمجھی جاتی تھی مگر آخر مبتلائے غضب ہوے جس کو قرآن مجید نے یوں بیان
کیا ہی:- لقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت فقلنا لھم
کونوا قردۃ خاسئین فجعلنا ھا نکالا لما بین یدیھا وما خلفھا
وموعظۃ للمتقین ہ اور اس واقعہ کو اسوقت کے موجودہ انسانوں کے
لیئے اور آئندہ نسل والوں کے لیئے عبرت بتایا گیا ہی۔ چونکہ خدا حلیم ہے جرائم پر
فی الفور نہیں پکڑتا ہی ہ ہاں مشو مغرور بر حلم خدا دیر گیرد سخت گیرد مر ترا +
لطف حق با تو مواساہا کند + چوں تو از حد بگذری رسوا کند + اس زمانہ میں اسیطرح
عجیب عجیب عنوان سے جواز سود خواری کی جدت کی گئی ہے۔ لیکن بنظر دقیق ایک
خرابی اس جدت میں یہ ضرور ہے کہ حرام کو حلال سمجھا کر مسلمانوں کو اس کی
رغبت دلانا جو کہ تعاونوا علی البر والتقویٰ کے سراسر خلاف ہی اسوقت بھی
جواز سود کے فتوی سے لوگ ایسے خوش ہیں۔ جیسے اصحاب سبت صید ماہی
کے حیلہ سے۔ چونکہ حصول عبرت کے لیئے قرآن میں قصص لائے گئے ہیں اور
اس قصہ کو جواز سود خواری کے فتوے سے ملا کر غور کرو گے تو بہت سی مفید
باتیں نکل آوینگی جو کہ مشابہت کی موید ہونگی۔ خلاصہ یہ ہی کہ گرچہ جواز سود

آگے دلائل کسیقدر دلچسپ ہوں مگر اے مسلمانو فلاح اسی میں ہے کہ تم اس سے باز رہو جس کو خدا نے حرام کیا ہو وہ ہر حال میں حرام ہی نام کے بدلنے سے وہ حلال نہیں ہوتا۔ اور نہ قلت وکثرت کو اس کے حلت وحرمت میں دخل ہی۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرنیوالے بھائیوں کو میری یہ مختصر تحریر مفید ثابت ہوگی۔ وما علینا الا البلاغ۔ وھو یھدی الی سبیل الرشاد۔

قال عزاسمہ ولکم نصف ما ترک ازواجکم (سورہ نساء) بی بی کے متروکہ میں بصورت عدم اولاد کے شوہر کا نصف حصہ ہوتا ہی۔ اسی آیت سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اخذ کیا ہی کہ شوہر اپنی عورت کو بعد موت کے غسل دیسکتا ہی۔ کیونکہ جب خدا نے عورت کے مرنیکے بعد بھی اسکو زوجہ کہا تھا یقینی طور پر وہ اس حالت میں بھی اسکی زوجہ ہے۔ علاوہ اس کے بعض موقعہ پر مثلاً سفر وغیرہ میں قرین مصلحت بھی مسلک شافعیؒ کا ہو جاتا ہی۔ البتہ احناف کے یہاں ناجائز ہی۔ اور دلائل فریقین کے مطولات میں دیکھو قال عزاسمہ وعبدولہ

ولا تشرکو بہ شیٔا وبالوالدین احسانا وبذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین والجار ذی القربیٰ والجار الجنب والصاحب بالجنب وابن السبیل وما ملکت ایمانکم ان اللہ لا یحب من کان مختالا فخورا (سورہ نساء) اس آیت میں خدا نے جملہ اخلاق حسنہ کو اور مستحقین کے حقوق کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہی۔ سب سے پہلی بات یہ ہی کہ اللہ کی پرستش کرو اور کسی کو شریک اسکا مت بناؤ خواہ شرک جلی ہو یا خفی اور والدین کے ساتھ احسان کرو اور حقوق ہمسایہ مع مدارج جار کی تفصیل بھی بتائی گئی۔ مثلاً جار ذی القربیٰ یعنی جو شخص کہ قرابت دار بھی ہو اور ہمسایہ بھی ہو تو اس کا حق مقدم ہی پھر

حقوق والدین وجواز وار شاد

غیر برادری والا ہمسایہ۔ پھر صاحب بالجنب یعنی وہ آدمی جو تمہارا ساتھی رہا ہو کسی سفر یا کسی تعلیم میں یا پیشہ میں الغرض درجہ بدرجہ ہر شخص کے حقوق کو ادا کرو۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ ہم مکتب یا ہم سبق تک کے حقوق کو قرآن نے تبلایا ہے لیکن معلم یا اُستاد کے حقوق کو قرآن نے اسجگہ کیوں نہیں ذکر کیا۔ سنیئے جس طرح قرآن میں حقوق والدین کی جا بجا تاکید آئی ہے اتنی تاکید حقوق اولاد کی نہیں تو کیا اسکی وجہ یہ ہے کہ اسکا کوئی حق نہیں ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ چونکہ انسان کو اولاد سے فطرۃً محبت ہوتی ہے۔ اور اسکی خبر گیری شوق اور ولولہ سے آدمی از خود کرتا ہے لہذا قرآن تاکید کرے یا نکرے وہ کام تو ہوتا ہی ہے۔ لہذا اس کے بیان کی ضرورت نہیں تھی مگر چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو ماں باپ نہیں تھے۔ لہذا بنی آدم ادا حقوق والدین میں فطرۃً قاصر ہیں اسی لیئے شریعت نے بار بار مختلف طریقہ سے اسکی تاکید کی ہے اور بصورت عدم بجا آوری حقوق والدین کے سخت عذاب کا وعدہ بھی کیا ہے۔ تو چونکہ اُستاذ بھی روحانی باپ اور مربی روح ہے تو جب جسمانی مربی کے مدارج معلوم ہو گئے تو پھر روحانی مربی کا حال خود معلوم ہو جاتا ہے علاوہ اس کے استاد کے حق کو بھی انسان فطرۃً واجب الادا سمجھتا ہے لہذا صاف اور موکد طور سے جا بجا بتلانیکی ضرورت نہیں تھی ضمنی طور سے حضرت خضر و موسیٰ علیہم السلام کے قصہ میں آداب شاگرد و اُستاد کے بتا دیئے گئے ہیں! انسان تو انسان ہے اچھی جانوروں کو دیکھو کہ جب بڑے ہو گئے۔ اور ماں سے پرورش کی حاجت باقی نہیں رہی تو یہ اپنے ماں باپ کو پہچانتے بھی نہیں ہیں۔ لیکن جوان بہائم کو تعلیم دیتا ہے اس کی اطاعت اور محبت سے یہ کبھی سرکشی نہیں کرتے ہیں جس نے کسی شریر گھوڑے کو تعلیم دیا ہے جب وہ معلم پکارتا ہے۔ گھوڑا متوجہ ہو کر تعمیل حکم کرنے لگتا ہے جانوروں میں اُستاد

کی اطاعت اور احسان کی حق شناسی کسدرجہ ہو اسکا مشاہدہ تو سرکس کے تماشہ دیکھنے والوں کو خوب حاصل ہو۔ یہی وہ حق ہے کہ جس سے جانور کو بھی انکار نہیں اور سلسلہ گناہ میں سب سے پہلی خطا بھی یہی ہے کہ شیطان نے اُستاد کے حق تعلیم کے مقابلہ میں بھی اپنی ذات کو بہتر جانا تھا۔ جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے قال یاآدم انبہم باسما فلما انباھم باسماءھم الخ یعنی جبکہ فرشتوں کو حضرت آدمؑ نے چیزوں کا نام بتا دیا تھا تب بعد اس کے حکم سجدہ کا دیا گیا تھا۔ اب یہ ثابت ہوگئی کہ جس انسان میں حق شناسی تعلیم نہیں ہے اور جو کہ حق فراموش معلم ہو۔ گویا وہ بہائم سے بدتر ہے۔ کیونکہ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ جس نے آدمی کا شکریہ نہیں ادا کیا اس نے خدا کا شکریہ نہیں ادا کیا بلکہ شیخ سعدی کا فیصلہ تو یہ ہے کہ **باتفاق خردمندان سنگ حق شناس بہ از مردم ناسپاس**۔ چونکہ زمانہ کی رفتار بدل گئی ہے۔ اور لوگوں کے اخلاق بگڑ رہے ہیں۔ لہذا اس حق پر مجھے توجہ دلانیکی ضرورت پڑی۔ گرچہ اگلے زمانہ میں بھی لوگوں نے ؎

کس نیاموخت علم تیر از من — کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

کہا ہو۔ مگر اسوقت شاذ ونادر اس کے بولنے کی نوبت آتی تھی۔ لیکن اسی دور میں ؎ شاگرد ایں زمانہ وقت سبق یگانہ ÷ چوں شد سبق میسر شاگرد شد بیگانہ ÷ کے مصداق بکثرت ہیں۔ لہذا۔ یا وفا خود نبود در عالم ÷ یا مگر کس دریں زمانہ نکرد کی تصدیق بھی بڑھتی جاتی ہے۔ **مقام عبرت** ہے کہ جانوروں میں کبوتر اور طوطا کی بیوفائی مشہور ہو۔ بلکہ طوطا چشمی تو ضرب المثل ہو۔ لیکن دیکھا جاتا ہو کہ تعلیم یافتہ کبوتر اپنی پرواز میں خواہ کسی قدر بلندی تک کیوں نہ پہونچا ہو مگر اسکا معلم جسوقت اسکو پکارتا ہے تو بجز تعمیل حکم کے اسکو دوسرا چارہ نہیں

ہے۔ مگر افسوس کہ تعلیم یافتہ انسان میں زیادہ تعداد ایسے آدمیوں کی ہے کہ صرف اُمید ترقی پر سب سے اول جو چیز ان کے دلوں سے بھلا دینے کے قابل ہی وہ حق تعلیم ہے ع بہ بیں تفاوت رہ از کجا ست تا بکجا۔ این چہ شوریست کہ در دور قمری بینم + ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم + دختراں را ہمہ جنگست و جدل با مادر + پسراں را ہمہ بدخواہ پدر می بینم + ھل جزاء الاحسان الا الاحسان میں مجملاً سب حقوق کیطرف کافی اشارہ موجود ہی۔

قال عز اسمہ لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ (سورہ نساء) یعنی نشہ کی حالت میں نماز مت پڑھو۔ گرچہ مشہور یہ ہے کہ یہ آیت قبل حرمت شراب کے وقت کی ہی۔ لیکن عارفوں کے نزدیک اسکا حکم ہمیشہ باقی ہی اس طور پر کہ نماز کے اندر تم ہر قسم کے نشہ سے علیحدہ ہو کر قلب کو حاضر رکھو۔ خواہ دولت کا نشہ ہو یا محبت اولاد کا نشہ یا کاروبار کا تصور یا مقدمہ کا خیال۔ الغرض نماز میں ہمہ تن متوجہ الی اللہ ہو جاؤ اور جملہ خیالات دنیاوی کو قلب سے نکال دو کیونکہ لا صلوٰۃ الا بحضور القلب بے اطمینانی کی نماز مثل جسم بے روح ہوتی ہے۔

قال عز اسمہ کلما نضجت جلودھم بدلنا ھم جلودا غیرھا لیذوقوا العذاب (سورہ نساء) یعنی جب دوزخیوں کا چمڑہ جل جائیگا تو خدا انکو دوسرا چمڑہ بدلدیگا اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ انسان اس جسم سی علیحدہ کوئی شئے ہی۔ کیونکہ عذاب مجرم کو دیا جاتا ہے۔ اگر جلد مجرم ہو تو اس کے جل جانے کے بعد دوسری جلد کو پیدا کرکے سزا دینا سزا غیر مجرم کی ہی۔ جو عدل کے خلاف ہے پس درحقیقت معذب وہ انسان ہی اور یہ جلد وغیرہ اعضاء ذریعہ وصول عذاب ہیں۔ جلد ماہیت انسان نہیں ہے اور تبدیل جلد سے مراد تبدیل صفت جلد ہی۔ نہ کہ تبدیل ذات جلد یعنے صرف احساس جلد کا زیادہ کردیا جاتا ہے۔

نمبر ۱۰ اجماع

قال عزاسمہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (سورہ نسار) چونکہ اولی الامر کی اطاعت پر مسلمان مامور ہیں لہذا ضرور ہی کہ وہ اولی الامر من المسلمین ہیں اور وہ محفوظ عن الخطا بھی ہوں۔ اور اسکو مسلمان جانتے بھی ہوں۔ اور جبکہ اس زمانہ میں امام معصوم کی معرفت اور انسے استفادہ اور تعلیم دشوار ہی۔ لہذا اسوقت اسکا مصداق اُمت کی وہ جماعت ہے جوکہ دینی امور کے اہل حل وعقد ہوں جسکا نام اجماع امت ہی لہذا اجماع کی حقانیت ثابت ہوتی ہی۔ جیساکہ حدیث میں ہی کہ لا تجتمع امتی علی الضلالتہ۔ ہاں بعد ظہور امام مہدی علیہ السلام کے مسلمانوں پر ان کی اطاعت واجب ہی۔

قال عزاسمہ افلا یتدبرون القرآن ط ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً (سورہ نسار) منافقین کو خطاب کرکے یہ کہا جاتا ہی کہ دیکھو قرآن نے اکثر تمھاری خفیہ سازشوں کو بتلایا ہی۔ اور اکثر واقعات آئندہ کی خبر دی ہی جس کو تم لوگوں نے ہمیشہ مطابق واقع کے پایا۔ پھر غور کرو کہ اگر یہ قرآن غیر خدا کا کلام ہوتا تو کبھی تو اختلاف پاتے جبکہ برابر اسکی خبروں کو تمنے صحیح پایا ہی۔ پھر کیوں نہیں ایمان لاتے ہو ہاں مرزا صاحب کی پیشین گوئیاں اکثر غلط ہوئیں۔ خاصکر محمدی بیگم سے نکاح کی فیصلہ کن پیشینگوئی نے دنیا میں اس امر کو ظاہر کردیا کہ غیر نبی کی پیشین گوئی اور خبر غلط ہوتی ہی۔

قال عزاسمہ واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا (سورہ نسار) اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حالت خوف کے سفر میں نماز کو قصر کرنا چاہیئے لیکن حالت امن کے سفر میں کیا کریں۔ اس سے نص بلاکت

ہی پس حالت امن کے سفر میں حکم قصر کا جز احادیث سے ہے بربنا ثبوت ما سکت عنہ القران کے۔

قال عز اسمہ والاتی تخافون نشوزہن فعظوہن واھجروھن فی المضاجع واضربوھن فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلا ان اللہ کان علیا کبیرا۔ (سورہ نساء) اس آیت میں خدا نے مردوں کو شوخ طبع و تند مزاج عورتوں کے ساتھ طریق معاشرت بتلایا ہی کہ اگر تمکو اپنی عورتوں کی شوخی اور نافرمانی کا خوف ہو تو پہلے تم انکو وعظ و نصیحت کرو شاید وہ سمجھ جائے اور اپنی عادت کو بدلدے اور یہ فہمائش بھی نرمی اور شیریں کلامی سے ہو تا کہ جلد اثر کرے۔ اب اگر عورت نے اپنی عادت کو بدلدیا تو پھر تمکو کسی قسم کی زیادتی کا حق نہیں ہی اور اگر یہ نسخہ کارگر نہو تب تو تم اس کے ساتھ کچھ دنوں کیواسطے سونا چھوڑ دو۔ شاید وہ اس ترکیب سے سنبھل جائے اب اگر اس سے بھی کام نہ نکلے تب کسیقدر معمولی مار پیٹ کرو۔ اس برتاؤ سے اگر اس نے اطاعت کرلیا تو فلا تبغوا علیھن سبیلا یعنی اس کی خطا کو معاف کردو اور پھر اس ترک مضاجعت یا مار پیٹ یا بیرخی و بے اعتنائی کا سلسلہ محض تکلیف دہی کی غرض سے ہرگز مت قایم رکھو۔ کیونکہ ان اللہ کان علیا کبیرا۔ اللہ بیشک بہت بڑا ہی۔ دیکھو تم خدا کے عتاب کو دفع کرنے کی قدرت و طاقت نہیں رکھتے ہو مگر بوجہ تقاضا بشریت کے تم خدا کی نافرمانی بھی کسی وقت ضرور کرتے ہو۔ مگر وہ رحیم باوجود اپنی زبردست طاقت اور تمھارے بے انتہا جرائم کے بھی وہ تمھاری ندامت کو قبول کرتا ہی پس اسی طرح سے یہ کمزور اور بے زبان عورتیں بھی کبھی تمھاری نافرمانی کرجاتی ہیں اور تمھارے غصہ اور عتاب کو گرچہ یہ دفع کرنیکی سکت نہیں رکھتی ہیں۔ لیکن جب یہ معذرت کریں تو تم متخلق باخلاق اللہ ہوکر ان کا

قصور معاف کر دیا کرو۔ ورنہ اگر عورتوں کی ندامت اور معذرت کے بعد بھی تم نے ان کمزوروں کو ستایا تو یاد رکھو کہ خداوند کبیر اس مظلومہ کی امداد کریگا۔ ہاں اگر تدابیر مذکورہ بالا سے بھی کام نہ نکلا اور شکایت باقی رہ گئی اور آئندہ کے مفاسد کا احتمال پیدا ہو گیا ہو تب۔ فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا

ان یریدا اصلاحا یوفق اللہ بینھما ان اللہ کان علیما خبیرا

یعنی اس حالت میں ایک محاکمہ یعنی پنچایتی قایم کرو جسمیں صرف میاں بیوی دونوں کے خاندان سے صاحب رائے وعقلمند لوگوں کی شرکت ہو اور یہہ فریقین کے ہمدرد ایک جگہ بیٹھکر اس معاملہ پر غور کریں کہ دونوں میں مظلوم کون ہی اور ظالم کون ہی۔ کیونکہ اگر کوئی مرد متبع شریعت اس بلا میں مبتلا ہو گیا ہو اور اسکا پالا کسی بدمزاج عورت سے پڑ گیا ہو۔ یا کوئی نیکبخت مومنہ کسی ظالم مرد کے ساتھ وابستہ کر دیگئی ہے۔ یا محض تقاضائے بشریت سے کچھہ ناگوار واقعات بین الزوجین پیش آ گئے ہیں۔ مگر اب دونوں نے اللہ کا خوف کر کے اور اصلاح کی نیت سے اگر اپنا معاملہ برادری کی پنچایتی میں دیدیا ہے تو اللہ کا وعدہ ہی کہ ہم دونوں میں میل کرا دینگے۔ کیونکہ خدا علیم ہی نیت کا حال وہ خوب جانتا ہی تعلم ما توسوس بہ نفسہ ہاں اگر وہ معاملہ اسدرجہ بگڑ چکا ہی کہ اب اصلاح کی کوئی صورت قایم نہیں رہی اور مرض بالکل لاعلاج ہو گیا ہی تو بطور آخر الحیل السیف کے طلاق کی اجازت بھی اسلام نے دی ہی

مگر وہ اجازت بھی نہایت حکمت کے اصول پر ہی یعنی الطلاق مرتان

فامساک بمعروف او تسریح باحسان۔ یعنی پہلے ایک یا دو طلاق دے اور بعد اس کے تقریباً تین ماہ تک وہ عورت شوہر کے یہاں عدت گذارے اور اس مدت عدت کا نان ونفقہ بدستور سابق شوہر ہی دیا کرے۔ دیکھو شریعت

محمدی نے اس مضبوط رشتہ کو دفعۃً توڑنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ بلکہ بعد طلاق کے بھی ایک کافی مدت دونوں کو سوچنے اور سمجھنے کے لئے دیگئی ہے۔ تاکہ آیندہ کی خرابیوں اور ذلت و رسوائی اور مجبوری کو اطمینان کے ساتھ دونوں غور کریں اور اپنے اپنے ہی خواہوں سے صلاح و مشورہ اس اہم کام میں کرلیں اور اگر مناسب ہو تو بطریقِ رجعت کے اس سابق نکاح پر دونوں میاں بیوی رہجاویں گے۔ اور انتظام خانہ داری اطمانیت سے چلتا رہیگا۔ ہاں البتہ اگر اس طویل مدت کے بعد باوجود اعزا و اقربار سے صلاح و مشورہ کے بھی بجز قطع تعلق کے کوئی دوسرا راستہ اپنی صلاح و فلاح کا نہیں پایا اور فراق دائمی ہی کو مرجح جانا تب یا تو رجعت نکرے یا تیسرا طلاق دیدے۔ اب اسوقت وہ عورت اس پر حرام ہوگی۔ اور شوہر سے ہمیشہ کے لئے جدا۔ جسکو قرآن نے یوں بتایا ہے کہ فان طلقہا فلا تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ۔ یعنی اب وہ عورت دوسرے مرد سے نکاح کرے اور شوہر ثانی سے بعد صحبت کے طلاق لے اور بعد انقضائے عدت کے شوہر اول کے نکاح میں آسکتی ہے۔ خیال فرمایئے کہ یہ محللہ کی شرط ایسی پر مصلحت ہے کہ جس کے تصور سے ہر شریف مرد اور شریف عورت یقیناً وقوع طلاق کے ہرگز خواہشمند نہ ہونگے۔ بلکہ رجعت ہی مرغوب ہوگی۔ البتہ اگر وہ اسباب ہی ایسے جمع ہوگئے ہوں کہ جسکا چارہ ہی انقطاع دائمی ہو تو بیشک اس انقطاع دائمی کی اجازت بھی ہمارے شریعت میں ہے۔ جیسے مریض عضو یا درد کو اپنے سے علیحدہ کرنا کبھی نہیں چاہتا ہے۔ اور اس کے اصلاح کی ہر ممکن تدبیر عمل میں لاتا ہے۔ لیکن جب سب معالجہ سے عاجز ہو جاتا ہے اور اسکا فساد دوسرے اعضاء تک متعدی نظر آتا ہے۔ تب مجبوراً اس عضو کو کاٹ کر علیحدہ کردیا جاتا ہے۔ بعینہ یہی

حالت اسلام میں وقوع طلاق کی ہی۔ بخلاف اس کے اس مسئلہ میں اور بذاہب

کی کیا حالت ہی اسکو حضرت مرشدنا کی کتاب پیغام محمدی میں ۔ دیکھو۔

قال عز اسمه وان من اهل الکتاب الا لیو منین به قبل موته (سورہ نساء)

موتہ میں جو ضمیر واحد مذکر غائب کی ہی اگر یہ راجع حضرت مسیح کیطرف ہے تو

مطلب یہ ہوگا کہ جتنے اہل کتاب بوقت نزول مسیح علیہ السلام کے موجود ہونگے

وہ رفع اور نزول مسیح پر حضرت مسیح علیہ السلام کے مرنیکے قبل ایمان لادینگے

اور مصلوبیت مسیح کے عقیدہ باطلہ سے تائب ہونگے۔ چونکہ اہل کتاب میں دو قسم

کا عقیدہ حضرت عیسیٰ کے متعلق تھا کوئی تو آپ کو مصلوب جانتا تھا اور کوئی

گروہ مقتول۔ لہذا ما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبه لهم کہکر ان دونوں عقیدوں کا

بطلان خدا نے اس کے اوپر والی آیت میں کردیا۔ اور اسوقت ایسا فرقہ کوئی نتھا

جو کہ حضرت مسیح کو موت طبعی سے مرا ہوا سمجھتا ہو۔ لہذا صاف طور سے وما مات

نہیں کہا لیکن بل رفعه الله الیه سے یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ جبکہ وہ زندہ

آسمان پر اٹھا لیئے گئے ہیں تو آیندہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حالت کیا ہوگی

آیا وہ موت سے مستثنیٰ کردیئے گئے ہیں یا صرف نفخ صور کے ساتھ انکو فنا ہونا

ہے یا مثل اور انسانوں کے کسی وقت موت طبعی کے ساتھ مرینگے۔ پس اسکا

جواب اس آیت میں دیدیا گیا کہ ایک وقت موت طبعی کا ذایقہ مسیح علیہ السلام کو

بھی اسی دنیا میں آکر چکھنا ہوگا۔ اور اسکی مفصل کیفیت رسول کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کی حدیثوں میں موجود ہی اور اگر یہ ضمیر اہل کتاب کیطرف راجع ہی تب

مطلب یہ ہی کہ وہ یہود جو آپ سے عداوت رکھتا ہی اپنے موت کے وقت مضطر

اور بیقرار ہوکر حضرت مسیح کے مرفوعیت پر ایمان لاتا ہے۔ اس کے متعلق تفسیر

کبیر میں روایت بھی درج ہے۔ مگر چونکہ وہ ایمان اضطراری ہوتا ہے لہذا مفید

نہیں ہے۔

قال عز اسمہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون
(سورہ مائدہ) یعنی جو شخص کہ خلاف شریعت کے حکم کرے گا وہ کافر ہے۔ یہ آیت
مخصوص ہے ساتھ کفار کے جیسا کہ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے
کہ یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جو کہ دل سے احکام الٰہی کو نہ مانے اور زبان سے بھی
انکار کرے اور جو شخص کہ زبان و دل سے حکم خدا کو مانتا ہے مگر خلاف عقیدہ کے
عمل کرتا ہے در حقیقت وہ حاکم بما انزل اللہ ہے گو کہ تارک فی العمل ہے لہذا وہ
کافر نہیں ہے جیسے اس عہد میں مسلمان رجسٹرار کہ انکو باوجود اعتقاد حرمت ربوا
کے سودی کاغذات پر شہادت لکھنی ہوتی ہے یا مسلمان حکام کہ جنکو اکثر مقدمات
میں مجبوراً خلاف قانون قرآنی کے اور مطابق قانون بادشاہ وقت کے فیصلہ کرنا
ہوتا ہے۔

قال عز اسمہ لاکلون من فوقہم ومن تحت ارجلہم (سورہ مائدہ) یعنی
درختوں میں بھی پھل خوب لگتا اور کھیت بھی سرسبز و شاداب ہوتا۔

قال عز اسمہ قال یا قوم ادخلوا الارض المقدسۃ التی کتب اللہ
لکم ولا ترتدوا علی ادبارکم فتنقلبوا خاسرین (سورہ مائدہ) اس آیت
میں اصل قصہ تو بنی اسرائیل کا ہے مگر چونکہ قرآن پاک کا ایک اعجاز یہ بھی ہے کہ
اس کے قصوں میں ہر زمانہ کے اقتضاء کے مناسب نصیحت و عبرت موجود ہے
اور باعتبار فائدہ کے زمانہ ماضی و حال دونوں کا یکساں تعلق ان قصوں سے
ہے لہذا زمانہ حال کے ساتھ اس قصہ کو یہ مطابقت ہے کہ مثلاً ایک شخص نے
کسی شخص سے بیعت کی اور چونکہ قلب انسانی مقام تجلی صفات ربانی ہے
اور دل ہی وہ پاکیزہ اور مقدس زمین ہے جو کہ برکات روحانی کی بارش کو قبول کرتی

کے لیئے ہر وقت آمادہ اور مستعد ہے۔ لہذا پیر نے مرید کو پہلا حکم یہ دیا کہ ادخلوا

الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم یعنی اے مرید تو اس زمین قلبی میں

داخل ہو جا اور اسکی خبرداری رکھ اور پوری کوشش کے ساتھ اس کی زراعت

کو شاداب و سرسبز رکھ کیونکہ اللہ پاک نے جملہ روحانی ترقیوں کی اعلیٰ استعداد اسی

مضغہ گوشت میں بخش ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ فی الجسد مضغۃ

اذا صلحت صلح الجسد کلھا واذا فسدت فسدت الجسد کلھا اور

اس زمین کی کھیتی یہ ہے کہ ہر وقت اسکو خدا کے ذکر میں مشغول رکھے۔ اور پیر نے

یہ بھی فرمایا ولا ترتدوا علی ادبارکم یعنی اب مرید ہو جانے کے بعد قدم پیچھے مت

ہٹانا۔ ورنہ خسارہ میں پڑ جاؤ گے اور حصول لذات جسمانیہ کی عادت کو اب بلکل

چھوڑ دینا۔ ورنہ فتنقلبوا خاسرین یعنی اگر پھر ویسے کام کرو گے تو خسارہ میں

پڑ جاؤ گے۔ کیونکہ انوار قلبی کو کام دنیا پر ترجیح دینے سے زیادہ۔ کون سا خسارہ

ہے؟ خیر وہاں سے تو وعدہ کر کے گھر آئے اور شوق بھی ہوا کہ کچھ ذکر شغل کرنا چاہیئے

آخر اسی کے بدولت تو ان بزرگوں کا نام ابتک روشن ہے۔ اب جو یاد خدا میں بیٹھے تو

سب سے پہلے مال کی محبت نے سر اٹھایا کہ اگر تم نے تسبیح لی تو میں تمہارے گھر سے

رخصت ہوتا ہوں انتظام کرنیوالا کوئی نہیں لڑکے ناتجربہ کار ملازم چور۔ سارا کاروبار

دیکھوں یا اللہ اللہ کروں۔ دو قدم چلے تھے کہ اگر چلے تو محبت اولاد ازواج گھوڑا

فٹن موٹر باغ تعمیر زاہد فریب حسینوں کا غمزہ الغرض ایک بڑی فوج قلب میں ڈیرہ

جما کے پڑی ہے۔ بس ہمت ہار بیٹھے کہ ان سب قوم جبارین کا مقابلہ کون کرے

اور میری بساط کیا ہے کہ اس ٹڈی دل فوج کو بھگا سکوں۔ ہملوگ تو دنیادار آدمی

ہیں یہ کچھ حضرت ہی کا کام ہے۔ بلکہ خدا جس کو چاہتا ہے۔ اسکو خود بزرگی عطا

کرتا ہے کوشش و محنت سے کیا ہوتا ہے۔ بزرگی تو ایک نعمت وہبی ہے۔ ہر کسے را

بہر کارے ساختند۔ لیس للانسان الا ما سعی تو امور معاش کیواسطے ہے نہ کہ معاد کے لئے۔ الغرض اس قسم کا حیلہ و بہانہ نکالکر الگ ہو گئے اور پیر سے جو وعدہ کیا تھا اس کی پروا نہ رکھی مختصر یہ ہے کہ پھر کبھی جب پیر صاحب سے ملاقات ہوئی پیر نے پوچھا کہ کہو جی اب کیا حالت ہے ہر سالنس میں اب تمھارے پاس نفاس کی تعداد کتنی پہونچی ہے۔ میاں مرید صاحب نے جواب دیا کہ نہ نہ دیلی نگال نہ آید زمور۔ حضور نفس فرعون کی ایک زبردست فوج قلب میں موجود ہے میری مجال نہیں کہ میں مقابلہ کر سکوں کیونکہ ان فیھا قوما جبارین۔ ہاں ایک صورت کامیابی کی یہ ہے کہ آپ ہادی و منزل شناس ہیں بس حضور محض اپنی کوشش سے اس فوج کو میرے دل سے نکالدیں اور کم از کم اتنا تو آپ کردیں کہ عبادت میں جی لگنے لگے اس کے بعد میں کرونگا الغرض سنت چور مرید تو اسی قسم کے حیلہ میں تمام عمر رہ گیا! اور جیسا قلب لیکر گیا تھا۔ ویسا ہی رکھا گویا اس نے فقیری کو کوئی حلوا سمجھا تھا جو تیار کرکے اس کے حلق سے اتار دیا جائے۔ اس قسم کے رسمی مریدوں کی بھی دو قسمیں پائی جاتی ہیں! ایک وہ جو کچھ کرتا بھی نہیں ہے اور نہ پیر سے کسی قسم کا لگاؤ رکھتا ہے۔ نہ کبھی ان سے ملتا ہے نہ ان سے محبت رکھتا ہے اس کی مثال تو ایسی سمجھو کہ جیسے کوئی لڑکا ایک روز کسی اسکول میں جاکر اپنا نام لکھا آیا اور پھر نہ کبھی اسکول گیا نہ گھر پر اس نے کتاب پڑھی ایسا شخص تو بالیقین جاہل ہی رہجاویگا۔ نہ اسکو علم حاصل ہوگا نہ تہذیب نہ سلیقہ اور دوسرا وہ ہے کہ جو ذکر شغل تو نہیں کرتا ہے لیکن شریعت ظاہری کے فرائض کو بجالاتا ہے اور شیخ سے محبت بھی رکھتا ہے اور برابر ان سے ملتا رہتا ہے تو حسب منشاء ھم الذی لا یشقیٰ جلیسھم کے ایسے لوگ بھی برکات روحانی سے کچھ نہ کچھ حصہ پالیتے ہیں۔ اگرچہ وہ پیر جس کے حصول کے لئے شیخ کی ضرورت ہوتی ہے وہ

تو عموماً محنت وسعی پر منحصر ہے لیکن پھر بھی ستم ادل دالوں سے یہ لوگ بدرجہا اچھے ہیں اس لیئے ہر انسان کو چاہیئے کہ کم از کم اپنے پیران سلسلہ سے محبت ضرور رکھے۔ کیونکہ یہ بھی ایک مفید اور بکارآمد اور توشۂ عاقبت ہے الاخلاء

یومئذٍ بعضھم لبعضٍ عدوٌ الا المتقین۔ بیشک پرہیز گاروں کی محبت قیامت میں کام آئیگی اور بزرگوں کی خدمت گذاری عوام کو عاقبت میں مفید ثابت ہوگی۔ ۵ گر نبی نیستی ز امت باش + چوں تو سلطان نۂ رعیت باش + جو کچھ مذکور ہوا رسمی مریدوں کا حال تھا اب طالب صادق اور حقیقی مرید کا حال سنیئے کہ جب اس نے اپنے بدن کو پست ہمت اور بزدل پایا تو اس نے یوں کہا

قال رجلان من الذین یخافون انعم اللہ علیہما ادخلوا علیہم الباب ج

فاذا اخلتموہ فانکم غالبون ۵ وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین اے دوستو خدا پر بھروسہ کرکے تم ملک دل میں داخل تو ہو جاؤ اور تھوڑی کوشش کرو تو اگر تم کوشش کر دیئے تو بالیقین تم غالب آجاؤ گے اور شیطانی فوج کو اطراف وجوانب قلب سے تم نکال دو گے اور خواہشات نفسانی کا تم پر غلبہ نہیں رہیگا بلکہ انکم غالبون تم غالب رہو گے جن لوگوں نے کچھ پایا ہے۔ وہ محنت اور کوشش سے پایا ہے دنیا عالم اسباب ہے اسمیں عادت اللہ کی بھی ہے کہ لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ کہ اللہ کسی کی محنت کو برباد نہیں کرتا ہے جو ویزدہ یا بندہ۔ گرچہ اس کی قدرت میں یہ بھی ہے کہ بغیر کسب و محنت کے بھی ولی بنا دے چنانچہ اگلے زمانہ میں خدا اپنی اس قدرت کا اظہار بھی بہت مرتبہ کر چکا ہے اور اکثر آدمی چشم زدن میں صاحب ولایت و کرامت ہو گئے ہیں لیکن ہمکو شاذ کے اوپر بھروسہ کرکے بیٹھنا نہیں چاہیئے۔ بلکہ عادت اللہ کے مطابق کرنا لازم ہے۔ پیر کے پاس بھی جو کچھ ہے وہ ان کی محنت کا ثمرہ ہے

مگر اتنی بات البتہ ہی کہ اس کوچہ میں قدم رکھنا بڑا دشوار کام ہے اور ہر قدم پر بھی خیال آتا ہی کہ قوم جبارین سے مقابلہ کرنا ہوگا ؎ عشق اول چوں بت خونی بود + تا گریزد زو کہ مردنی بود + پھر برس دو برس کے بعد کچھ نہیں. مگر چونکہ اس راستہ میں خطرات اور مہالک بھی ہیں لہذا بغیر مدد شیخ کامل کے چلنا محال ہے ؎ بہ تنہا ماند شدن طفل خرد + کہ مشکل بود راہ نادیدہ بود + تو ہم طفل راہی بسعی اے فقیر + برو دامن نیکمردان بگیر + مریدان بقوت ز طفلاں کم اند + مشائخ چو دیوار مستحکم اند + بیاموز رفتار از ان طفل خرد + کہ چوں استعانت بدیوار برد + برو خوشہ چیں باش سعدی صفت + اکہ گرد آوری خرمن معرفت + اصلی غرض پیری مریدی سے یہی ہے لیکن ہمیشہ اس قسم کے مریدوں کی تعداد کم ہوتی آئی ہے زیادہ لوگ صرف کسی بزرگ کو اپنی توبہ کا گواہ بنا لیتے تھے۔ اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کے طفیل سے ہم بچ کر ان گناہوں میں مبتلا نہ ہونگے. مگر اب میرے زمانہ میں تو قسم اولی کے مُرید بالکل شاذ و نادر پائے جاتے ہیں! ور قسم ثانی میں بھی زیادہ ایسے آدمی ہیں کہ جنھوں نے بیعت کے بھی اپنی ایک بھی بری عادت کو چھوڑنیکی ہرگز کوشش نہیں کی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

قال عز اسمہ وما من دابة فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم (سورہ انعام) ہر جانور اور چڑیا بھی مثل انسان کے ایک جماعت ہی۔ گرچہ وحوش وطیور کو انسان سے چند قسم کی مشابہت ہی لیکن مشابہت مخصوصہ یہ ہی کہ سب اپنے خالق کو پہچانتے ہیں اور اسکی حمد کرتے ہیں۔

قال عز اسمہ حتی اذا جاء احدکم الموت توفته رسلنا وهم لا یفرطون (سورہ انعام) یعنی جب کسی کے موت کا وقت آجاتا ہے تو ہمارے فرشتے اسکی جان قبض کرتے ہیں۔ اور اللہ یتوفی الانفس حین موتها سے معلوم

ہوتا ہے کہ مارنا خاص اللہ کا کام ہے اور یتوفاکم ملک الموت سے سمجھا جاتا ہے
کہ مارنا حضرت عزرائیل علیہ السلام کا کام ہے۔ ان آیتوں میں حقیقۃً کوئی اختلاف
اور تعارض نہیں ہے کیونکہ موت کا اختیار تو فی الحقیقت خدا کو ہے۔ لیکن اس
عالم ظاہری میں یہ کام خدا نے حضرت عزرائیل علیہ السلام کے سپرد کر دیا ہے
مگر وہ تنہا خود ہی ہر جگہ قبض ارواح نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اس کام میں اور ملائکہ
بھی انکے اعوان و انصار ہیں۔ پس اس لحاظ سے توفی کی منافت ہر ایک کے
طرف درست و جائز ہے۔

قال عز اسمہ وھو الذی خلق السموات والارض بالحق و یوم
یقول کن فیکون۔ (سورہ انعام) مخالفین اسلام خاصکر آریہ نے کن فیکون
پر بڑا شور مچایا ہے۔ اور بزعم اپنے مادہ کی قدامت پر ایکو حجت ٹھہراتے ہیں اسطرح
پر کہ اگر مادہ موجود نہیں تھا تو لفظ کن کس کو کہا گیا۔ اور اس امر کا مخاطب کون
ہے اور یہ آریوں کا مایۂ ناز اعتراض ہے جس سے کم علموں کو دام تزویر میں پھانستے
ہیں۔ علماء نے اسکا جواب یوں دیا ہے کہ جس کو تم امر کہتے ہو یہ تمہارا مغالطہ ہے
ہرگز یہ امر اور خطاب نہیں ہے کیونکہ بصورت امر ہونے کے دو حال سے خالی
نہیں ہے مخاطب یا تو موجود ہوگا یا معدوم اگر موجود ہے تو بذریعہ لفظ
کن کے موجود ہونے کے لیئے مخاطب کرنا تحصیل حاصل ہے۔ اور تحصیل حاصل
ناجائز ہے۔ اور اگر تم یہ کہو کہ مادہ تو موجود تھا لیکن اب اسکو دوسری شکل وصورت
میں لانے کے لیئے اور مرکب ہونے کے لیئے مخاطب کیا جاتا ہے۔ تب ہم یہ کہیں گے
کہ اسمیں خدا کی خصوصیت کیا ہے اور اس کی قدرت خدائی کیا ہوئی کیونکہ یہہ
کام تو دن رات انسان سے بھی ہوتا ہے کہ اللہ پاک کے پیدا کردہ مواد و اسباب
سے نئی نئی چیزیں بنایا کرتا ہے اور اگر معدوم کو مخاطب کیا گیا ہے۔ تب بھی محال

تفسیر کن فیکون

مناظرہ خلیل

ہر کیونکہ معدوم میں خطاب کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ کن سے خطاب اور امر نہیں ہے بلکہ کن فیکون سے سرعت نفوذ ارادہ خداوندی کا اظہار ہے۔ مثلاً ہم لوگ جب ایک مکان بنانے کا ارادہ کرتے ہیں تو بہت سے مواد اور سامان کے محتاج ہوتے ہیں۔ اور ایک عرصہ تک ان اسباب کے فراہمی میں مشغول ہوتے ہیں۔ یعنی علت مادی اور فاعلی کے بعد علت صوری اور علت غائی کا وجود ہوتا ہے یعنی انسانی ارادہ اتنے عرصہ کے بعد حاصل دلپورا ہوا کرتا ہے۔ لیکن اللہ پاک اپنے تکمیل ارادہ میں کسی مادہ انصار اعوان کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ جلد سے جلد وہ تکوین وایجاد پر قادر ہے۔ ایسی بسیط زمین اور ایسا محیط آسمان اس نے بغیر مدد کسی کے محض اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ اور اگر بغرض محال کن فیکون کے واقعہ کو ہم خطاب بھی کہیں تب بھی اہل اسلام کو مضر نہیں ہے اس بنا پر کہ مخاطب میں وجہ موجود ہے۔ اور فی وجہ معدوم ہے۔ موجود تو فی علم اللہ تعالیٰ ہے اور معدوم فی الخارج پس معدوم فی الخارج کو فی الفور موجود فی الخارج کر دیتا ہے۔ علاوہ اس کے بطلان قدامت مادہ پر بیشمار دلائل مطولات میں مذکور ہیں۔

قال عز اسمہ فلما جن علیہ اللیل رأ کوکبا قال ھذا ربی فلما افل قال لا احب الآفلین۔ (سورہ انعام) عام طور سے یہ مشہور ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہوش سنبھالا اور خالق کی تلاش ہوئی۔ تو جس وقت ستارہ پر نظر پڑی تو اس نے فرمایا کہ ھذا ربی اسی طرح چاند اور سورج کو دیکھکر لیکن علماء محققین نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ کواکب کی ربوبیت کا اقرار کرنا باجماع امت کفر ہے اور یہ بھی اجماع سے ثابت ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے کبھی کفر سرزد نہیں ہوا ہے نہ عمداً نہ سہواً

بلکہ وہ ایام طفولیت سے معصوم عن الکفر ہیں۔ پس مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مناظرہ کے وقت اپنے باپ والی قوم سے پہلے
تو اصنام کی برائی بیان کی کہ انی اراک وقومک فی ضلال مبین ہ
پھر ان کے وقت اپنے مخالفوں سے استہزاءً یہ فرمایا کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ
ستارا میرا رب ہے۔ یا چاند۔ یا سورج کیونکہ سورج میں تو بڑی چمک ہے۔ اجی
نہیں میں تو ان سب چیزوں کے خالق کی پوجا کرتا ہوں۔ ان اشیاء کی افالتہ کو
نہیں دیکھتے ہو۔ پس عبودیت اور افالتہ کی دلیل بیان کر کے کواکب پرستوں کو
شرمندہ کر دیا اور ان کے عقیدہ کی کمزوری کو بتلا دیا اور لا احب الافلین کے
ضمن میں کس خوبصورتی سے توحید خداوندی کی تبلیغ آپ نے کی ہے۔

قال عز اسمہ ومن ذریتہ داود وسلیمان وایوب
وموسیٰ وھارون وکذلک نجزی المحسنین وزکریا
ویحییٰ وعیسیٰ والیاس کل من الصالحین (سورہ

انعام) اس آیت میں غور کرنے سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ حضرت
ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام پر اللہ کے اسقدر احسانات ہوئے ہیں کہ ان
کا درجہ بھی بلند کیا گیا اور اس کے فدیات کو بھی نبوت و نعمت عطا ہوئی دوسری
بات یہ ہے کہ کذلک نجزی المحسنین یعنی اللہ کی عادت ہے کہ محسنوں کی اولاد کو
بھی نعمت دیتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ بھی
ذریات میں ابراہیم علیہ السلام کے کیا گیا ہے۔ حالانکہ حضرت مسیح کو حضرت
خلیل سے انتساب بواسطہ والدہ کے ہے۔ پس اولاد بنات کا بھی ذریات
میں شمول نص سے ثابت ہوا۔ اب مقام غور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو
باوجودیکہ ابناء کے سلسلہ سے بھی ذریات ہیں اور محض بواسطہ بنات بھی لیکن

ارادت و خلافت

خدا نے جہاں ان ذریات کو جو کہ بواسطہ انباء کے آپ سے ملتے ہیں نعمتیں بخشی ہیں وہاں اس ذریت کو (جو کہ محض بواسطہ مادری آپ سے منسوب ہیں) بھی نعمت عطا کی اور نبی بنایا۔ اب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت کو خدا نے کیا کیا نعمتیں عطا کی ہیں اسکا اندازہ لگانا مشکل ہے ۵ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔ اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ حضور کے اولاد و ذریات کا سلسلہ دنیا میں حضرت جنابہ سیدہ النساء رضی اللہ عنہا کے طرف سے باقی ہے اور اولاد ذکور میں سے کوئی سلسلہ نہیں چلا۔ لہذا سب سے قریب ذریت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرات حسنین علیہما السلام ہیں۔ مگر چونکہ نبوت حضور کے ذات پر ختم ہو گئی ہے اس لیئے نبوت کے بعد جو اعلیٰ اور اشرف درجہ ہے وہ امامت ہے پس حسنین ؑ کے امام برحق ہونیمیں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے اور بیشک آپ امام ہیں لیکن وقت رحلت رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دونوں امامین ۷۔۸۔ برس کی عمر کے تھے اور بوجہ صغر سنی کے فی الفور دونوں بھائیوں میں سے کسی کو یہ عہدۂ خلافت و امامت تفویض نہیں ہو سکتا تھا اور اسمیں غالباً مصلحت یہ تھی کہ خدا نے سورۂ نور میں وعدہ کیا تھا کہ وعد

اللہ الذین آمنو منکم و عملو الصالحات لیستخلفھم فی الارض

کما استخلف من قبلھم و لیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم

و لیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعنی ہم ان مومنوں کی ایک جماعت کو خلافت ارضی عطا کریں گے۔ جو کہ اس آیت کے نزول کے وقت ایمان لا چکے تھے۔ چونکہ اس وعدہ کی آیت میں سیاق سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ موعود لھم کی ایک جماعت ہے کیونکہ ہر جگہ صیغہ جمع کا لایا گیا ہے۔ لہذا صحت اطلاق جمعیت کے لیئے کم سے کم تین ایسے شخصوں کا خلیفہ ہونا تو ضروری تھا۔ اب

اگر امامین صغیر سنی میں نہیں ہوتے تب تو سب سے زیادہ آپ کا حق تھا۔ اور جب نظم خلافت ان کے ہاتھ میں فوراً آجاتا تو خلاف وعدگی ہو جاتی۔ کیونکہ حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت راشدہ کی مدت کو محدود فرما دیا ہے کما رادی الترمذی عن سفینہ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول الخلافۃ ثلثون سنۃ ثم یکون ملکا عضوضاً۔ یعنی تیس برس تک خلافت راشدہ ہوگی۔ پھر سلطنت ہو جائیگی۔ لہٰذا خلیفہ کا انتخاب شوریٰ اور ووٹ پر موقوف ہوا۔ اب وقت انتخاب کے اگر حضرت علی کرم اللہ وجہ کا تقرر ابتدائً ہو جاتا۔ تو ایک خرابی یہ لازم آتی کہ بوجہ محدود ہونے ایام خلافت راشدہ کے پھر بھی خلف فی الوعد لازم آتا کیونکہ اللہ کے علم میں تو یہ بات معلوم تھی کہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جناب شیر خدا علیہ السلام اس دنیا میں انتیس برس سات مہینہ نو روز تک تشریف رکھیں گے۔ پس اس لحاظ سے ایک خلیفہ جناب امیر علیہ السلام اور دوسرے چند ماہ سیدنا امام حسن علیہ السلام ہوئے الغرض دو خلیفہ ہوتے ہیں۔ جو کہ وعدہ کے خلاف ہے۔ وعدہ تھا جمع کے لیئے اور منظور تھا تشنیہ کے ضمن میں۔ اور دوسری خرابی یہ لازم آتی کہ جب شیر خدا معاملات ملکی کے نظم و نسق میں مشغول ہو جاتے تو پھر صاحبزادوں کی تعلیم باطنی جو باقی رہ گئی تھی اسکو کون پورا کرتا۔ کیونکہ اس ذات کی تعلیم کے لیئے سوا آپ کے اور کون شخص موزوں تھا۔ اور انا مدینۃ العلم وعلی بابھا کے ضمن میں غالباً اسی امر کی طرف اشارہ ہے کہ بجز شیر خدا کے سبطین علیہما السلام کا معلم دوسرا نہیں ہو سکتا ہے۔ اب خدا نے اپنے وعدہ کو بھی اس طرح سے پورا کیا۔ اور جن اصحاب اربعہ پر خدا کی مزید مہربانی اور عنایت تھی اور جسکو اللہ نے اس عہدہ جلیلہ کے لیئے پیدا کیا تھا۔ ان سب کو اللہ نے اس نعمت

سے سرفراز بھی کردیا۔ وہ صورت یہ ہوئی کہ سب سے پہلے انتخاب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہوا۔ جب خلافت کے معاملہ سے مسلمانوں کو اطمینان ہوگیا۔ تو سب سے اول جو کام مسلمانوں کے مدنظر تھا وہ حجۃ الوداع کی وصیت پر عمل کرنا یعنی انی تارک فیکم الثقلین ما ان تمسکتم من تضلو ابعدی احدھما اعظم من الاخر کتاب اللہ وعترتی۔ اہل بیتی یعنی قرآن اور اہل بیت انہیں دونوں کو مضبوط پکڑنے سے فلاح ونجات ہے۔ اب قرآن کی یہ حالت تھی کہ اسوقت پورا قرآن ایک جگہ مکتوب نہیں ہوا تھا۔ متفرق طور سے لوگوں کے پاس سورہ وآیات تھے۔ لہذا ایک کمیٹی ہوئی اور یہ رائے قرار پائی کہ عہد نبوی کے مشہور اور ممتاز قراء کی موجودگی میں تمام سے آیتیں جمع کی جائیں اور اسکو بعد شہادت شاہدین اور تصدیق ممبران مجلس کے زید رضی اللہ عنہا لکھا کریں چونکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی کاتب وحی تھے الغرض بڑی احتیاط اور جدوجہد کے بعد جب ان مشاہیر قراء کے زیر نگرانی میں خلیفہ اول کے حکم سے قرآن مجید کا پورا نسخہ عہد خلافت صدیقی میں تیار ہوگیا تو اس نسخہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کے مجمع میں جسمیں خاص طور سے مدینہ کے مشہور اور بڑے نامی قاری بھی شریک اور موجود تھے جن کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت عثمان بن عفان ابی بن کعب زید بن ثابت عبداللہ بن مسعود ابو عبیدہ ابو موسی اشعری رضی کے سامنے پڑھکر سنایا جب باتفاق آراء یہ منظور ہوگیا کہ اب کوئی آیت باقی نہیں رہی ہے اسوقت سے وہ نسخہ برابر حضرت ابوبکر رض کے پاس رہا اور بعد آپ کے حضرت حفصہ کے پاس رہا۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو آپ نے اپنے عہد خلافت کے دوسرے سال یعنی سنہ ۱۴ھ میں تاریخ کو قائم کیا

اور اس ذریعہ سے ہر سال پورا قرآن مسلمانوں کو سنا دیا جایا کرتا تھا تاکہ اسکی صحت کو ہر طرح سے مستحکم کردیا جاوے۔ چنانچہ ابتک یہ طریقہ آرہا ہے کہ اگر کسی حافظ سے ایک زیر زبر کی بھی غلطی ہوتی ہے۔ تو فوراً اسکو لقمہ دیدیا جاتا ہے پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ نہایت مستحسن طریقہ تھا کہ اس طرح پر گویا ہر شخص مجاز تھا۔ کہ اگر قرآن میں کوئی غلطی یا کمی یا خلاف ترتیب دیکھتا تو وہ ٹوک سکتا تھا اس طریقہ سے اس قرآن کے صحت پر اجماع امت ہوگیا۔ پھر عہد خلافت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جب یہ بات مشہور ہوئی کہ دیہات کے رہنے والوں کو لغت فصیحہ قریش کا ادا کرنا کچھہ دشوار معلوم ہوتا ہے۔ لہذا اس کے ہم معنی لفظ کہیں کہیں یہ لوگ بدلا دینا چاہتے ہیں۔ یا شاید کسی نے ملایا بھی ہو پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصحف صدیقی کو حضرت حفصہ کے یہاں سے منگوایا۔ اور بغرض مزید احتیاط کے اسکو قرار مذکورین سے پھر پڑھوا کر اور اطمینان کرکے اُسی اہتمام سابق کے ساتھ حضرت عثمان نے اسکی سات نقلیں لکھوائی۔ اور ایک مکہ معظمہ اور ایک مدینہ طیبہ اور باقی اور اطراف ملک میں بھجوا دیا۔ اور حکم دیدیا کہ چونکہ قرآن لغت قریش میں نازل ہوا ہے۔ لہذا مصاحف کا مقابلہ لوگ اسی مصحف سے کرلیں اور دوسرا کوئی نسخہ اس کے خلاف کہیں رہنے نہ پاوے۔ یہ وجہ ہے کہ لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جامع القرآن کہتے ہیں کہ قرآن کے جمع کرنے کی تکمیل ان کے عہد میں ہوئی اور اطراف ملک میں اسکی تبلیغ و اشاعت سے فراغت ان کے زمانہ خلافت میں حاصل ہوئی۔ ورنہ درحقیقت خلفاء ثلاثہ بلکہ خلفاء اربعہ جامع القرآن ہیں پھر جب زمانہ خلافت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا پہونچا تو آپ نے بھی اسی مصحف کو برقرار رکھا۔ اور کوئی اختلاف نہیں کیا۔ کیونکہ اسکی صحت اور

جمعیت میں تو شیر خدا کی بھی شرکت تھی اور اس قرآن میں تو کسی کو اختلاف وشک باقی نہیں تھا پس یہ اسی قرآن مجید کی نقل ہے۔ جو کہ ہملوگ کے پاس موجود ہی مختصر یہ ہے کہ خلفاء ثلثہ بلکہ اکثر اصحاب کی کوشش و توجہ سے تقریباً پچیس برس کے عرصہ میں نہایت عمدگی کے ساتھ قرآن مجید کی ایسی اشاعت ہوگئی کہ الفاظ اور آیات یا ترتیب قرآن مخالفین کے تغلب تصرف ورد و بدل سے بالکل محفوظ ہو گئے۔ ادہر اسی عرصہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھی سبطین علیہم السلام کی تعلیم سے فراغت ہوگئی۔ تو پھر شیر خدا مسند آرا سریر خلافت ہوئے۔ اور بعد اس کے سیدنا امام حسن علیہ السلام اور جب خلافت کو منتقل بامارت وسلطنت ہونیکا زمانہ آگیا تو آپ نے اسکو چھوڑ دیا اور ان نعمار باطنی کی تعلیم و ترویج میں مصروف ہو گئے جو کہ خاص اہلبیت کا حصہ تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اکثر سلسلہ مشائخ کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے واسطہ سے جاری ہی۔ الغرض خلافت راشدہ کے وقت میں یہ دونوں نعمتیں اس طرح سی جمع کردی گئیں کہ اب آیندہ نسل والے سلمانوں کو بڑی آسانی ہوگئی قرآن سی بھی فائدہ حاصل کریں اور اہلبیت سے بھی فیض پاویں چنانچہ اسلام کی اشاعت انھیں دونوں کے طفیل میں ابتک ہوتی ہے کسی جگہ علمار ظاہر نے وعظ و نصیحت سے اسلام پھیلایا ہے۔ اور اکثر جگہ خرمن انوار مرتضوی کے خوشہ چینوں نے اسلام کو جاری کیا جیسے اجمیر شریف کے علاقہ میں خواجہ غریب نواز نے اپنی باطنی قوت کے بدولت اسلام کی اشاعت کیا ہی۔

حاصل کلام یہ ہی کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل بہت سے رسل و انبیاء ہوے ہیں۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر نعمت نبوت ختم کردیگئی۔ اسی طرح سے اللہ نے نعمت خلافت راشدہ کو ال محمد پر مکمل و تمام

کردیا۔ علاوہ اس کے آل محمد پر کیا گیا برکات اللہ نے نازل کیا ہے۔ اسکو اسی سے قیاس
کرو کہ تیرہ سو برس سے تمامی دنیا کے مسلمان اللھم بارک علی محمد و علی
آل محمد ذرات پڑھ رہے ہیں۔ ان کثیر التعداد دعاؤں کے ثمرات و برکات
کیسے ہوں گے وہ محتاج بیان نہیں ہوں گے۔ اللھم صلی علی سیدنا محمد
عزانہ بعدد کل معلوم لک۔ جب ہم اس آیت میں غور کرتے ہیں کہ محمد الر

سول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم۔ اور
خلفاء ثلثہ کے دینی خدمات کو مطالعہ کرتے ہیں تو ان بزرگوں کے آپسمیں ہرگز
کسی کا خلاف نہیں پاتے ہیں۔ بلکہ یہ سب ایک دوسرے کے ہمدرد تھے جس
سے جو بن پڑا اس نے دین کے مضبوط بنانیمیں محض لوجہ اللہ کوشش کی شیخین
کی سوانحعمری سے یہ مسئلہ روشن ہوجاتا ہے کہ انھوں نے اپنے ایام خلافت میں
اپنی ذات یا اپنی اولاد کے لیئے خلافت میں کوئی بھی حق قایم نہیں کیا۔ اور انکی
خلوص کا نتیجہ یہ تھا کہ ان بزرگوں کے وقت میں اسلام کو ترقی بھی خوب ہوئی
چونکہ خلفاء ثلثہ کا دامن غصب وحسد وعداوت اہلبیت سے قطعاً اور یقیناً
پاک تھا۔ لہذا ابتک نام نیک انکا دنیا میں روشن ہے اور روشن رہیگا۔ کسی
ریاست کے مختلف محکمہ کے علیحدہ علیحدہ افسر ہوتے ہیں تو کیا ان افسروں کو
آپسمیں ملال و رنج ہوتا ہے۔ ہرگز نہیں مگر رعایا پر سب افسر کی وقعت لازم
ہے۔ اور قرآن پر عمل اور اہلبیت کے ساتھ محبت واجب ہے ہر محب اہلبیت کو
اپنے محبوب کی روش پر چلنا چاہیئے۔ اور اسکا شاید کوئی قائل نہیں ہوگا۔ کہ
اہلبیت کرام علیہم السلام گالی گلوج سب وشتم کرتے ہونگے۔ بلکہ اہلبیت کی شان
تو کاظمین الغیض والعافین عن الناس ہے۔ اس لیئے شاہ عبدالعزیز رحم
باوجودیکہ امیر معاویہ کو لکھتے ہیں کہ از زمرہ بغات بود لیکن لعن و تبرا کو پسند

نہیں کرتے ہیں میرے ذہن میں جو بات اس آیت کے متعلق آئی اسے سینے
خلوص سے قلمبند کردیا ہی۔ اگر کوئی خاکسار کے معروضات کو بنظر انصاف کے
تعصب وغیرہ سے علیحدہ ہو کر پڑھیگا۔ تو ممکن ہے کہ شاید اسمیں کوئی بات کام
کی ایسے شخص کو اس حقیر تحریر میں ملجاوے کہ جس سے خلفاء ثلثہ رض کیساتھ
اسکو حسن ظن عـ۱۰ حاصل ہوے۔ مومنان معدود لیک ایمان یکے + جسم شان معدود
لیکن جان یکے + جان گرگان وسگان از ہم جداست + متحد جانہای شیران
خداست + اب ناظرین کو ہم پھر دوبارہ رحماء بینہم پر خاص توجہ دلاکر اس مضمون کو
ختم کرتے ہیں۔ واللہ ہو الموافق الصواب۔

قال عز اسمہ وما قدروا اللہ حق قدرہ اذا قالوا ما انزل اللہ
علی بشر من شیٔ (سورہ انعام) ترجمہ جن لوگوں نے یہ کہا کہ خدا نے کسی انسان
پر کچھہ نازل نہیں کیا ہی۔ انہوں نے خدا کی قدر نہ کی۔ اے نبی ان سے یہ تو کہیئے
کہ پھر موسی پر کتاب کس نے نازل کیا۔ کیونکہ وہ بھی تو انسان تھے۔
اب اس آیت میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ما انزل اللہ اگر مشرکین
نے کہا تھا تو جواب میں قل من انزل الکتاب الذی جاء بہ موسی سے
کوئی الزام نہیں ہی۔ کیونکہ کفار جس طرح حضور کے نبوت کے منکر تھے اسی طرح سے
حضرت موسی کو بھی نہیں مانتے تھے اور اگر اہل کتاب نے ما انزل اللہ کہا
تو یہ دشوار ہی۔ کیونکہ ایسا وہ کہہ نہیں سکتا تھا۔ انکا تو عقیدہ ہی کہ توریت حضرت
موسی ع پر نازل ہوئی ہے۔ شان نزول اسکی یہ ہی کہ مالک بن معصب ایک
یہودی عالم تھا۔ جو کہ نہایت موٹا تھا۔ اس سے حضور نے فرمایا کہ میں تم کو قسم
دیتا ہوں اس ذات کی کہ جس نے حضرت موسی پر توریت اتارا ہی کہ کیا تم
توریت میں پاتے ہو۔ کہ اللہ موٹے عالم کو دوست نہیں رکھتا ہے چونکہ وہ ہمکا

عـ۱۰
ناظرین وہ مسلم کیسا خوش نصیب ہی جو کہ کربلائے معلی میں دفن ہو کیونکہ اگرچہ وہ مجرم بھی ہو لیکن بوجہ قرب روضۂ اطہر کے مومنین اس کو آغوش رحمت میں جاگزین سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہی کہ سید الشہدا علیہ السلام کے جوار میں دفن ہونیکی آرزو ہر مومن کے دل میں ضرور ہوتی ہی اور یہ سبکو معلوم ہی کہ شیخین رضی اللہ عنہما جلیل القدر صحابی ہیں اور رحمۃ اللعالمین وشفیع المذنبین کے جوار میں مدفون ہیں اب باوجود ان باتوں کے اگر مومنین شیخین رض کی شان میں تبرا و دشنام روا رکھیں تو سخت تعجب ہی۔ ۱۲ منہ

مصداق تھا۔ لہذا غصہ میں آکر اس نے یہ کہدیا کہ اللہ نے کسی آدمی پر کچھ نازل نہیں کیا ہے۔ اس کے شاگردوں نے تو ہاں میں ہاں ملا دیا۔ مگر اور یہود جو وہاں موجود تھے اُنھوں نے مالک سے کہا کہ کمبخت تو نے تو حضرت موسیٰ کی تکذیب کی لہذا میں تم کو منصب ریاست سے معزول کرتا ہوں۔ اور اسکی جگہ پر کعب بن اشرف کو اپنا رئیس مقرر کیا۔ پس اس خاص واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے اور اس سورہ میں یہی ایک آیت مدنی ہے۔ بقیہ سب مکّی اور بیک دفعہ نازل ہوئی ہے۔

دلیل ۱۰

قال عز اسمہ لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر (سورہ انعام) یعنی آنکھیں اللہ کو ادراک نہیں کرتی ہیں اور وہ آنکھوں کو ادراک کرتا ہے۔ اہلسنت نے اس آیت سے جواز رویت باری تعالیٰ کا ثبوت لیا ہے اس طور سے کہ خدا نے یہ فرمایا کہ اسکو کوئی دیکھتا نہیں ہے۔ تو جب چیز کے فی نفسہ قابل الرویت نہو مثلاً روائح یا مذوقات یا مسموعات تو یہ عدم رویت اس کے حق میں مدح نہیں ہے یہ کوئی نہیں کہتا ہے کہ فلاں آواز ایسی اچھی ہے کہ اسکو سُن تو سکتے ہیں مگر دیکھ نہیں سکتے۔ کیونکہ آواز کا ادراک تو قوت سامعہ سے تعلق رکھتا ہے باصرہ کو اس سے کچھ علاقہ نہیں ہے تعریف تو جب ہے کہ وہ شےَ تو فی نفسہ قابل الرویت ہو لیکن پھر بھی میری نگاہیں اس کے دیکھنے سے عاجز ہیں۔ علاوہ اس کے ہم اسبات کو تسلیم نہیں کرتے ہیں کہ ادراک عن البصر مطلق رویت کا نام ہے۔ بلکہ رویت ایک جنس ہے جس کے تحت میں دو نوع ہے ایک رویت مع الاحاطہ اور دوسرا رویت بغیر احاطہ کے اور احاطہ کے ساتھ دیکھنے کا نام ادراک ہے جس کی نفی قرآن نے کی ہے کہ کوئی نگاہ اس کو ادراک نہیں کر سکتی ہے۔ اور رویت بغیر احاطہ کا انکار اسمیں نہیں ہے۔ بلکہ اس سے سکوت ہے جس کو ہم خبر احاد سے ثابت کرتے ہیں۔ کیونکہ کوئی حکم

بذریعہ خبر احاد کے خلاف منطوق آیت ثابت کرنا ممنوع ہے۔ لیکن ثبوت ما سکت منہ القرآن بالخبر الاحاد جائز ہے۔ لیکن جب تک یہ لگا ہیں دنیا ہیں ان اوصاف کے ساتھ موجود ہیں۔ اسکو یہ میسر نہیں آتا ہے۔ لیکن عاقبت میں بعد تبدل اوصاف کے انشاء اللہ مسلمانوں کو ضرور جنت میں دیدار خدا نصیب ہوگا۔

قال عز اسمہ خذوا زینتکم عند کل مسجد (سورۂ اعراف) اسکا مطلب یہ ہے کہ نماز میں ستر عورت کو چھپانا چاہیئے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ مسجدونکو خوب نقش ونگار سے آراستہ کرو۔

اعراف

قال عز اسمہ وعلی الاعراف رجال ۰ الخ (سورۂ اعراف) اعراف ایک بلند اور معزز مقام ہی جس میں اہل محشر کے بہترین لوگوں کو خداوند عالم حساب و کتاب کے عرصہ تک رکھیگا۔ تاکہ وہ بھی محاسبہ کا منظر ملاحظہ کریں۔ اور اپنے فرمانبرداروں کی جزا اور دشمنوں کی سزا کو دیکھلیں۔ پھر جبوقت حساب وکتاب سے فراغت ہوجائیگی اسوقت یہ حضرات اعراف سے منتقل کرکے جنت کے عالی درجہ پر پہونچادیئے جائینگے۔ بلکہ جنت میں بھی برابر اس کے مدارج بلند ہوتی رہینگے

واما الذین سعدوا ففی الجنۃ ما دامت السموات والارض الا ما شاء ربک ۰ میں استثنا سے خروج من الجنۃ مراد نہیں ہی بلکہ خروج میں درجۃ ودخول فی درجۃ عالیۃ منہا۔ مقصود ہے جس کے زیادہ مستحق اہل اعراف ہیں۔

استوٰی علی العرش

قال عز اسمہ ثم استوی علی العرش (سورہ اعراف) کلام عرب میں عرش اس تخت کو کہتے ہیں جس پر کہ بادشاہ بیٹھتا ہے۔ لیکن یہ معنی نفس ملک میں بھی مستعمل ہے۔ جیسا کہ بولتے ہیں ثل عرشہ یعنی کمزور ہوگئی سلطنت اس کی پس مطلب آیت کا یہ ہوا کہ جب اللہ نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا

تو عرش عظمت وجلال پر ممکن ہو کر تدبیر کونین کی کرتا ہے جیسا کہ سورۂ یونس کی اس آیت سے اشارہ پایا جاتا ہے ان ربکم اللّٰہ الذی خلق السموات والارض ثم استوی علی العرش یدبر الامر۔ شاہان دنیا کی طرح سے کرسی یا تخت پر بیٹھنا ہرگز مراد نہیں ہے۔ اور نہ مسلمان اس کے قائل ہیں معترض چونکہ اہل عرب کے محاورات سے نابلد ہے لہذا اعتراض کیا کرتا ہی۔

قال عز اسمہ قال الملاء الذین استکبروا من قومہ لنخرجنک یا شعیب والذین امنو معک من قریتنا او لتعودن فی ملتنا (سورہ اعراف) ترجمہ ان لوگوں نے حضرت شعیب علیہ السلام سے یہ کہا کہ اگر آپ ہملوگ کے دین میں داخل ہو جاویں۔ تب تو فبہا ورنہ آپ کو بستی سے نکالدینگے عود کے جی کبھی بمعنی صیرورت بھی آتا ہے جیسے کہ یہاں۔ مگر جب اس قوم پر نزول عذاب کا وقت قریب آگیا تب آپ خود وہاں سے چلے آئے جیسا کہ فتولی عنہم سے سمجھا جاتا ہے کیونکہ کسی قوم پر نبی کی موجودگی میں عذاب نہیں آتا ہے ماکان اللّٰہ لیعذبہم وانت فیہم۔ قوم مستحق عذاب سے انبیاءؑ نزول عذاب کے قریب بحکم خداوندی علیحدہ ہو جاتے ہیں۔

قال وامر قومک یاخذوا باحسنہا (اعراف) اے موسیٰ تم اپنی قوم کو حکم کرو کہ توریت کے احسن احکام کو لیں۔ گرچہ حکم خدا سب کے سب احسن ہی ہوتے ہیں لیکن بعض میں بہ نسبت بعض کے فضیلت زیادہ ہوتی ہی۔ مثلاً نماز کے تنہا بھی موجب ثواب ہی لیکن جماعت کے ساتھ باعث مزید ثواب۔

قال عز اسمہ واذا اخذ ربک من بنی آدم من ظہورہم ذریتہم واشہدہم علی انفسہم الست بربکم قالوا بلی۔ (سورہ اعراف) یعنی خداوند تعالے کی وحدانیت وربوبیت کا جمیع بنی آدم نے روز

واقعہ عہد الست

ازل میں اقرار کیا تھا۔ سماجیوں کا یہ کہنا کہ جس طرح سے عہد الست کا واقعہ اس عالم میں آکر یاد نہیں رہتا ہے اسی طرح جزا و سزا تو بطور تناسخ ہوتی ہے لیکن مجرم کو اپنا جرم یاد نہیں رہتا ہے۔ یہ قیاس مع الفارق ہے۔ کیونکہ انسان جس کام کو ایک سکنڈ یا ایک منٹ کے لئے عمر میں صرف ایک بار کرتا ہے۔ تو اسکو عادۃً بھول جاتا ہے۔ بجز نہایت ذکی اشخاص کے لیکن جس کام کو تمام عمر کرتا ہے۔ یا جس بستی میں زمانہ دراز تک رہتا ہے اسکو تو غبی بھی نہیں فراموش کرتا ہے پس چونکہ عہد الست کا واقعہ محض قلیل وقت میں ہوا تھا۔ لہذا بجز انبیاء اور ائمہ یا اکابر اولیاء اللہ کے اور عوام کو یاد نہیں رہتا ہے۔ اور جب تناسخ ذریعہ جزا و سزا ہے۔ تب تو سزایاب کو ضرور معلوم ہونا چاہیئے کہ فلاں کام کی یہ سزا مل رہی ہے علاوہ اس کے عہد الست تو کوئی دار العمل نہیں تھا۔ بلکہ صرف ایک تعلیم تھی وحدانیت کی وہ تعلیم سب کو یاد ہے۔ بلکہ ع بنیر باد قالوبلیٰ در خروش والے کتنے افراد مسلمانوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آواز الست بر بجم کی گویا ابتک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

قال عز اسمہ واتل علیھم نبأ الذی اٰتینٰہ اٰیٰتنا فانسلخ منھا فاتبعہ الشیطٰن فکان من الغاوین۔ ولو شئنا لرفعنٰہ بھا ولکنہ اخلد الی الارض واتبع ھوٰہ فمثلہ کمثل الکلب ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث (سورہ اعراف) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت بلعم باعورا کے متعلق ہے۔ کیونکہ خدا نے اس کو اسم اعظم بتایا تھا لیکن جب اس نے نفس اور خواہشات دنیا کی پیروی کیا اور دنیا کے طرف مائل ہوگیا پس اسکا وہ علم بھی سلب کرلیا گیا۔ اور ایسا پستی میں گرا کہ آج قرآن نے اسکو نہایت ذلیل مخلوق یعنے کتا سے تشبیہہ دی یہ آیت

علماء کے واسطے تازیانۂ عبرت ہے کہ جب بلعم باعورا باوجود ذاتی خصوصیت اور شرافت کے بوجہ بے عملی کے اپنے منصب سے ایسا گرا کہ مثل کتّا کے ذلیل ہے۔ تو پھر کسی کو مجرد علم سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ علم کی غرض عمل ہے اگر یہ ہے تو سبحان اللہ اور اگر عمل نہیں ہے تو ایسا عالم ذلیل اور نالائق ہے۔ اللھم انی اسئلک علماً نافعاً و قلباً خاشعاً و عملاً متقبلاً

؎ علم گر بر دل زند نورے بود + علم گر بر تن زند مارے بود + کتا باوجودیکہ نجس ہے لیکن تعلیم یافتہ کتا اگر مطابق تعلیم کے شکار کرتا ہے۔ تو اسکا شکار نجس نہیں کہلاتا ہے۔ بلکہ بوجہ شرافت تعلیم کے اسکا شکار کیا ہوا جانور مسلمانوں کو حلال ہے کما قال تعالیٰ قل احل لکم الطیبات لا و ما علمتم من الجوارح مکلبین تعلمونھن مما علمکم اللہ فکلوا مما امسکن علیکم واذکروا اسم اللہ علیہ واتقوا اللہ ان اللہ سریع الحساب اس سے علم با عمل کا رتبہ موازنہ کر لو۔

قال عز اسمہ و ذروا الذین یلحدون فی اسمائہ سیجزون ما کانوا یعملون (سورۂ اعراف) یعنی جو کوئی اللہ کے ناموں میں الحاد کرتے ہیں عنقریب انکو سزا دیجائیگی۔ خدا کے نام میں الحاد کی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ اس کے نام سے دوسرے کو پکاریں۔ دوسرے یہ کہ جو نام خلاف شان خداوندی ہو اس نام سے خدا کو یاد کریں۔ تیسرے یہ کہ بغیر معنی سمجھے ہوئے خدا کو کسی نام سے پکاریں۔ خدا کے ناموں میں الحاد

قال عز اسمہ فلما اتاھما صالحاً جعلا لہ شرکاء (سورۂ اعراف) اس آیت میں بطور مثال کے صورت حال مشرکین کا ذکر ہے۔ کہ مشرکین اپنی اولاد کو بتوں کا عطیہ سمجھتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کے

متعلق ہے۔

قال عز اسمہ انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلو
بھم واذا تلیت علیھم ایاتہ زادتھم ایمانا وعلی ربھم
یتوکلون۔ الذین یقیمون الصلوٰۃ ومما رزقنا ھم ینفقون ۵
اولٰئک ھم المومنون حقاً لھم درجات عند ربھم ومغفرۃ
ورزق کریم (سورہ انفال) سچے مسلم کی تعریف اس آیت میں یہ بتائی گئی
ہے کہ جو اللہ کا ذکر سنکر کانپ اُٹھے اور کلام اللہ سنکر اسکا ایمان زیادہ ہوجاوے
اور خدا پر اسکا بھروسہ بھی ہو اور نماز و زکوۃ کا پابند بھی ہو۔ ایسا شخص البتہ
موعود بالنجاۃ ہے۔ اب ہر شخص خود اپنی حالت کو غور کرلے کہ اللہ کی بتائی ہوئی
نشانیوں میں سے اسمیں ایمان کی کتنی علامت پائی جاتی ہے جس میں جس قدر
باتوں کی کمی ہے اسیقدر اس کے ایمان میں ضعف و نقصان سمجھو۔ گرچہ اذا
تلیت آیاتہ علیھم جمیع فرائض منصوصہ مثلاً نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوۃ۔ کو
شامل ہے مگر پھر خصوصیت کے ساتھ نماز اور انفاق فی سبیل اللہ کو ذکر کرنیمیں
اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عاشقان خدا صرف نماز فریضہ پر اکتفا نہیں
کرتے ہیں۔ بلکہ نوافل میں بھی مشغول رہتے ہیں۔ اور فقط ادائے زکوٰۃ پر
قناعت نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ خیرات و صدقات میں ان کو ایک خاص دلچسپی
رہتی ہے۔

قال عز اسمہ یا ایھا الذین امنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا
ویکفر عنکم سیاتکم ویغفر لکم واللہ ذو الفضل العظیم (سورہ
انفال) اے ایمان والو اگر تم خدا سے ڈرو گے تو ہم تمھارے گناہ کو معاف
کردینگے۔ یہ جملہ شرطیہ ہے اور شرط و جزا میں مغائرت چاہیئے پس شرط

تقویٰ اور جزا مغفرت گناہ اور بصورت وجود تقویٰ کے گناہ کہاں سے آیا لہذا مطلب اس جملہ شرطیہ کا یہ ہے کہ اگر تمنے بوجہ خوف خدا کے کبائر سے اور عمداً گناہ سے پرہیز کیا اگر کچھ صغائر تمسے سہواً صادر ہو گئے ہوں تو ہم معاف کردینگے یعنی پرہیزگار کا سہو و نسیان بغیر توبہ کے معاف ہوجاتا ہے۔

قال عز اسمہ ماکان للمشرکین ان یعمروا مساجد اللہ شاھدین علیٰ انفسھم بالکفر (سورہ توبہ) عمارۃ مسجد کے دو معنی ہیں ایک اسمیں عبادت کرنی۔ اور دوسرے اسمیں تعمیر پس منشاء آیت کا یہ ہوا کہ کفاروں سے تعمیر مسجد میں امداد نہیں لینی چاہیئے۔ رہا کفاروں کا مسجد میں جانا پس اگر بغیر اجازت مسلم کے ہے تب تو اوسکو منع کیا جاوے۔ اور اگر مسلمانوں سے اجازت لیکر داخل ہو تب کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد ثقیف کو مسجد میں جگہ دی تھی۔ حالانکہ وہ سب کافر تھے۔

قال عز اسمہ اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا (سورہ توبہ) غار حرا میں جسوقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے تو آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایمان اور خلوص اور وفاداری پر پورا یقین تھا ورنہ اس خطرناک موقعہ پر ہر ایک مشکوک آدمی کو آپ نہیں لیجاتے اس غار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی تسلی کی تھی جس کا تذکرہ اس آیت میں کیا گیا ہی۔

قال عز اسمہ لا یاتون الصلوٰۃ الا وھم کسالیٰ ولا ینفقون الصلوٰۃ الا وھم کارھون (سورہ توبہ) اسمیں منافقوں کی مذمت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ وہ نماز سستی اور آسکت سے ادا کرتا ہے اور بدلی کے ساتھ

راہ خدا میں خرچ کرتا ہی اس سے معلوم ہوا کہ عبادت کی روح یہ ہی کہ اسکو بندہ
بغرض اظہار اپنی عبودیت و عجز کے جوش و مستعدی کے ساتھ ادا کرے تب تو وہ
مقبول ہی اور نافع اور اگر قہراً جبراً ہو تو وہ بجائے فائدہ رسانی کے موجب وبال ہی
یہ علامت بتا دیگئی اب ہر شخص خود سمجھ سکتا ہے کہ اس سے عبادت منافقانہ
طور پر ادا ہوتی ہے یا مومنانہ اصول پر واضح ہو کہ صرف تحصیل مال موجب فخر
نہیں ہی۔ بلکہ اسکا راہِ خدا میں محبت سے خرچ کرنا اسی لیئے مسلمانوں پر مالی عبادت
بھی فرض کر دیگئی ہے۔ تاکہ معلوم ہو جاوے کہ کس کو خدا کی محبت غالب ہے
اور کس پر مال کی محبت۔

قال عز اسمہ قل ھو اذن خیر لکم یومن باللہ ویومن للمومنین
(سورۂ توبہ) شان نزول اس کی یہ ہے کہ ایک مرتبہ کسی منافق نے اپنی جماعت
میں خلاف شان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی لفظ استعمال کیا۔ جس پر دوسرا
شخص بولا کہ ایسا مت کہو شاید ان کو معلوم ہو جاوے تو مشکل ہو۔ اُس پر جلاس
بن سوید بدبخت نے یہ کہا کہ اجی جو کچھ جس کے جی میں آوے وہ بولا کرے جب
ہملوگ رسول اللہ صلعم کے پاس پہونچینگے تو قسم کھا کر پالگ جائینگے اور
انکو میری قسم کا اعتبار ضرور ہو جائیگا۔ کیونکہ آپ (اذن ہیں) یعنی لوگوں کی
بات سن لیا کرتے ہیں پس اس واقعہ کی بذریعہ اس آیت کے خبر دیگئی ہے۔ ہاں
ایک پیچیدہ امر یہ ہی کہ یومن باللہ تو سب جانتے ہیں یہ یومن للمومنین کے کیا
معنی۔ سنو قاعدہ یہ ہے کہ ایمان کا صلہ جب حرف با کے ساتھ آتا ہے۔ تب تو
بمعنی اقرار وحدانیت والوہیت کے ہوتا ہے جیسے امنت باللہ اور اگر
اسکا صلہ لام کے ساتھ آتا ہے تب بمعنی یہ ہوتا ہے کہ کسی کی بات کو سچ
جاننا جیسے للمومنین میں۔

نفاق مغلظ ارتداد ہے

قال عز اسمه وجاهد الكفار والمنافقين واغلظ عليهم وماواهم جهنم ط وبئس المصير (سورۂ توبہ) منافقین چونکہ اپنا کفر پوشیدہ رکھتے ہیں اسلیئے انسے ساتھ جہاد کی صورت یہ ہے کہ جس کو مسلمان قرائن و قیاس سے یا اس کے چال واطوار سے منافق سمجھتے ہوں اس کیسامنے دلائل مذہب حقہ کو بیان کریں اور ان لوگوں سے راہ و رسم کم کردیں۔ کیونکہ جہاد کے معنی لغت میں بذل جہد ہیں۔ یعنی خدا کی راہ میں کوشش کو صرف کرنا خواہ بالسیف ہو۔ خواہ باللسان یا بطریقہ دیگر۔ جبتک وہ منافق مستور الحال ہے اسوقت تک اس کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ کرنا چاہیئے تاکہ اسکو عبرت ہو اور وہ نفاق سے باز آوے۔ اور اس کا ایک قول بھی اس کے کفر پر دلالت صریحہ دے تب وہ شخص مرتد کے دائرہ میں آجاتا ہے۔ اور اگر وہ اپنے ایک عقیدہ کفریہ کی بھی تشہیر و ترویج کرتا ہے۔ تب تو وہ بدترین مرتد ہوجاتا ہے کیونکہ لقد قالو کلمته الکفر سے اس امر کا اشارہ ہے کہ ایک کلمۂ کفر بھی موجب ارتداد ہوجاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یوسف نجار کا ناجائز بیٹا کہتا ہو تو اسکا صرف یہ ایک قول مستلزم استہزار آیت اللہ و تکذیب نص و توہین ایک جلیل القدر رسول کو ہے پس ایسے شخص کو لازم ہے کہ فی الفور توبہ کرے اور اگر اس نے بجائے توبہ کرلینے کے اس قبیح عقیدہ کو اس نے اور دیگر نیں پھیلانا شروع کیا۔ تو وہ مرتد ہوگیا ایسے شخص کے واسطے اس آیت میں خدا نے وعدہ کیا ہے کہ یعذبهم الله عذابا اليما في الدنيا والاخرة یعنی دونوں جہان میں اسپر عذاب کا وعدہ ہے۔ اور اسکو ذمی اور مستامن کسی حیثیت سے بھی روئے زمین میں پناہ نہیں ملنی چاہیئے۔ کیونکہ حکم خدا ہے وما لهم في الارض من ولي ولا نصير اور بیشک اگر ایسے بدعقیدہ کی

نصرت کی جاوے۔ تب تو یہ باعث ہوگا۔ دوسرونکے تخریب عقیدہ کا اب عذاب
دنیاوی اس پر خدا بطور خود بھیجے گا۔ یا مومنوں کے ہاتھ سے بذریعہ قتل کے
اسکی تحقیق کتب فقہ سے کرو۔ منافق عنداللہ تو کافر ضرور ہے۔ بلکہ بدترین کافر
لیکن اکثر نفاق منجر بارتداد ہو جاتا ہے پس اسوقت اسکا پوشیدہ اور دیرینہ
کفر مسلمانوں پر بھی ظاہر ہو جاتا ہے اور احکام مرتد کے اس پر مسلمان جاری
کرتے ہیں۔

قال عز اسمہ ولا تصل علیٰ احدٍ منھم مات ابداً ولا تقم
علیٰ قبرہٖ۔ (سورۂ توبہ) بعض احکام ایسے ہیں کہ مطابق خیال حضرت عمر
رضی اللہ عنہ کے نازل ہوئے ہیں۔ منجملہ اس کے ایک تو یہی ہے۔ قصہ یوں ہی
کہ جب عبداللہ بن سلول منافق مرگیا۔ اور حضور نے اس کے جنازہ کی نماز کا ارادہ
کیا۔ اسوقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ دیا کہ حضور اس منافق کی نماز
مت پڑھیئے۔ کیونکہ یہ دین کا درپردہ بڑا دشمن تھا۔ اور اسی اثنار میں حضرت
جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے۔ اور یہ آیت نازل ہوئی جسکا ترجمہ یہ ہے
کہ اے نبی کوئی منافق مر جاوے تو آپ نماز جنازہ نہ پڑھا کریں۔ اور نہ کسی
منافق کے قبر پر تشریف لے جایئے۔ کیونکہ منافقوں کو خدا ہرگز ہرگز نہین
بخشیگا۔ اور منافق اسی کو کہتے ہیں۔ جو کہ بظاہر اپنے کو مسلمان کہتا ہو۔ اور باطن
میں وہ اسلام کے خلاف عقیدہ رکھتا ہو پس جو کوئی حضرت مریم کو باعصمت
نہ مانے وہ منافق ہے۔ کیونکہ مسلمان بالاتفاق از روئے نص قرآن کے حضرت
مریم کو باعصمت مانتے ہیں۔

قال عز اسمہ والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار
والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ نعم

جنات تجری من تحتہا الانہار خالدین فیہا ابدا ذالک الفوز العظیم (سورہ توبہ) ترجمہ:۔ اگلے مسلمان یعنی مہاجرین اور انصار اور ان کے بعد والے وہ مسلمان جنھوں نے بھلائی میں اصحاب کی اتباع کی ہو سب سے خدا راضی ہوا اور یہ لوگ خدا سے راضی ہوئے۔ الغرض یہ آیت سراپا بشارت جمیع صحابہ رضی اللہ عنہم کے حق میں ہے۔ کیونکہ من المہاجرین میں من بیانیہ نزدیک اکثر علماء و مفسرین کے مانا گیا ہے۔ چنانچہ محمد بن کعب سے کسی نے پوچھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے آپس میں جو معاملات رنجش و ملال کے ہوئے ہیں اس کے متعلق مجھے نہایت تشویش ہے۔ آپ اسمیں کیا فرماتے ہیں۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ جب خدا نے سب کو بخش دیا تو اب ہمکو تمکو کوئی وجہ تردد کی نہیں رہی۔ جبکہ اصحاب کا مغفور ہونا نص سے ثابت ہے۔ سائل نے متعجب ہو کر کہا کہ قرآن میں کہاں ہے مجیب نے یہی آیت پڑھی اور مطلب یہ سمجھا دیا کہ یہ حضرات تو مغفور ہیں۔ بلکہ آیندہ نسل کے مسلمانوں کو اسمیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ اگر یہ بھی اصحاب کی پیروی اچھی باتوں میں کریں گے تب یہ سب بھی مستحق رضوان کے ہو جائینگے اس لیئے ہر مسلمان کو لازم ہے کہ کسی صحابی کے شان میں کوئی لفظ بے ادبی کا نہیں استعمال کرے اور ان بزرگوں کے دینی خدمتوں کی اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ جان نثاریوں اور وفاداریوں کی عظمت کیجاوے کیونکہ اصحاب کے ساتھ احسان سے پیش آنیوالوں کے لیئے بھی اس آیت میں وعدہ مغفرت رضوان موجود ہے۔ لہٰذا اس آیت کے مفہوم کو مدنظر رکھنا چاہیئے اور ان بزرگوں کے آپس میں جو کچھ معاملات ہوئے ہیں اسکا فیصلہ میرا جزو ایمان نہیں ہے جو ہم اس کے درپے ہوں۔ ہمکو تو یہ حکم ہے کہ اصحابی کالنجوم بایہم

اقتدیتم اهتدیتم۔ پس ہر وہ مسلمان جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت کا شرف میسر ہے ہمارے لیئے واجب الاحترام ہیں۔

قال عز اسمہ والذین اتخذو مسجدا ضرارا وکفرا وتفریقا بین المومنین وارصادا لمن حارب اللہ ورسولہ من قبل ط ولیحلفن ان اردنا الا الحسنی ط واللہ یشھد انھم لکاذبون ○ لا تقم فیہ ابدا ط (سورہ توبہ) چند منافقوں نے ایک مسجد اس غرض سے بنائی تھی کہ جسمیں مسجد قبا کو ضرر پہونچے لیکن قسمیں کھاکر یہ کہا کرتے تھے کہ ہمنے اس کو اللہ کی عبادت کے واسطے بنائی ہے جس کی اس آیت میں تردید کردیگئی کہ یہ سب جھوٹے ہیں آپ ہرگز اس مسجد میں نماز نہیں پڑھیئے۔ اصل چیز نیت ہی دیکھو بظاہر تو وہ مسجد تھی مگر چونکہ نیت اچھی نہ تھی اس لیئے اسکا نام مسجد ضرار ہوگیا۔ اور حضور کو ادا نماز سے اس مسجد میں خدا نے منع کردیا۔ لہذا ہر مسلمان کو دینی کام میں نیت بخیر رکھنا چاہیئے۔ ہرگز ریا اور کوئی دنیاوی غرض کو کسی امر دینی میں مخفی نہیں رکھنا چاہیئے۔ ورنہ وہ بیکار ہو جائیگا۔ اور ایسی مجلس وعظ یا دعوت وغیرہ میں جانا بھی نہیں چاہیئے جو کہ اس غرض سے قایم کیگئی ہو کہ جسمیں کسی کی توہین و ذلت ہو یا واعظ کی غرض کسی دوسرے مدرسہ یا جماعت کو کمزور کرنیکی ہو۔ انما الاعمال بالنیات حدیث سے ثابت ہے

ما دروں را بنگریم و حال را ۔۔۔ نہ بروں را بنگریم و قال را
ناظر قلبم اگر خاشع بود ۔۔۔ گرچہ در گفتار ما خاضع بود
شرم بادت زخدا غیر خدا می خواہی

قال عز اسمہ التائبون العابدون الحامدون السائحون الآیہ (سورہ توبہ) بروایت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ کے سائحون سے علم دین کا طالب مراد ہے

خلاصہ یہ ہے کہ اتنے لوگوں کے لئے اسمیں بشارت ہے منجملہ اس کے دینی طالب علموں کو بھی بشارت دیگئی۔

قال عز اسمہ ما کان استغفار ابراهیم لابیہ الا عن موعدة

وعدها ایاہ فلما تبین انہ عدو للہ تبرا منہ ان ابراهیم

لاواہ حلیم (سورہ توبہ) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول سے یعنی واغفرلی لابی انہ کان من الظالمین سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے مشرک باپ کیواسطے دعاء مغفرت کیوں کی۔ کفار کے واسطے تو دعاء مغفرت ناجائز ہے۔ جسکا جواب خدا نے اس آیت میں یہ دیدیا ہے کہ چونکہ ان کے باپ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ایمان لاوینگے۔ اسی لحاظ سے دعاء حصول ایمان کی بحق اپنے باپ کے کی تھی ...... مگر جب انکو اس امر کا یقین ہوگیا کہ وہ ایمان نہیں لانے والے ہیں۔ تب سے آپ بیزار ہوگئے۔

صداقت

قال عز اسمہ یاایها الذین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصادقین (سورہ توبہ) اے ایمان والو خدا سے ڈرو۔ اور صداقت کا ساتھ دو۔ صداقت کی خوبی پر تو دیانتہً ہر شخص متفق ہے۔ اور جھوٹ کو ضرور بُرا جانتا ہے حتیٰ کہ ابتداءً جھوٹ بولنے سے شیطان کو بھی نفرت تھی۔ چنانچہ جو وقت کے اس نے بنی آدم کے اغوار کا دعویٰ کیا۔ اور چونکہ جمیع ابناء آدم کے اغوار کا دعویٰ غلط تھا۔ لہذا جھوٹ سے بچنے کے لئے ابلیس نے الا عبادک منهم المخلصین کہا دروغگوئی وہ بری شئے ہے جس سے شیطان نے بھی پہلے پرہیز اور احتیاط کیا ہے۔ مگر آجکل کتنے مسلمان ایسے نظر آتے ہیں کہ جسکا پیشہ جھوٹی گواہی دینا ہے۔ قرآن کے تعلیمات سے مسلمانوں کو اتنا بعد ہوگیا کہ کہیں کہیں اب تو مولوی اور مشائخ بھی گواہوں کو جھوٹی گواہی کی تعلیم دیتے ہیں اور اس جرم عظیم

ان ناخداترسوں کی اعانت روپئے سے بھی کرتے ہیں۔ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی
حکمت کا پیشہ حلال اور جائز ہی۔ لیکن اب اِس پیشہ میں بھی کچھ ایسے آدمی پائی جاتے
ہیں۔ جو کہ بلا ضرورت محض اپنی طمع اور حماقت کے سبب سے جھوٹ بولکر پیسہ
کماتے ہیں۔ اور اس عنوان سے اس حلال آمدنی کو بھی حرام بنا لیتے ہیں۔

قال عزاسمه فلولا نفر من کل فرقة طائفة ع لیتفقهوا فی الدین
ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون۔ (سورہ توبہ)
اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہی کہ علم دین سیکھنے کی غرض ہدایت خلق ہی۔ اور علمار
پر وعظ و نصیحت کرنا واجب ہی جس نے اس غرض سے علم سیکھا پس وہ سید ہی
اب وہ انذار عام ہے تحریری ہو یا تقریری۔ یا جہاں جیسی ضرورت ہو اس قسم کی
انذار و ہدایت کرے۔

قال عزاسمه اولا یرون انهم یفتنون فی کل عام مرة او مرتین
ثم لا یتوبون ولا هم یذکرون۔ (سورۃ توبہ) حضرت ابن عباس
رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہی کہ انسان بذریعہ بیماری و مصیبت کے سال میں دو ایک
مرتبہ جانچا جاتا ہے جس سے منافق کو کوئی عبرت نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ وہ اور
زیادہ ناشکرا ہو جاتا ہے۔ لیکن بندہ مومن حالت مرض میں اپنے گناہوں کو
یاد کرکے نادم ہوتا ہی۔ اور بعد صحت کے نیک کام میں مشغول ہو جاتا ہی۔ الغرض
بیماری اور مصیبت کے بعد بھی جس شخص میں بُرائی علیٰ حالہ باقی رہجاوے
ایسا شخص منافق ہی یعنی ایمان کامل نہیں رکھتا ہی رب اغفر لی
واهدنی صراط المستقیم۔

قال عزاسمه واجعلوا بیوتکم قبلة ٥ یہ آیت متعلق بنی اسرائیل کے ہی
بیوت سے مراد بعض علمار نے مساجد لیا ہی۔ تب تو مطلب یہ ہوا کہ بنی اسرائیل

تو تعمیر مسجد کا حکم دیا گیا تھا تاکہ لوگ مساجد میں نماز پڑھیں اور اگر بیوت سے مطلق گھر مراد ہی تب مطلب یہ ہوا کہ گھروں میں بھی نماز پڑھا کرو۔ چنانچہ اسلام میں بھی یہی حکم ہی کہ مسجد میں فرض نماز ادا کرنا افضل ہی اور نوافل گھر پر۔

قال عز اسمہ قد اجیبت دعوتکما فاستقیما ولا تتبعان سبیل الذین لا یعلمون۔ (سورہ یونس) قصہ یوں ہی کہ جب فرعون کو ہر طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام سمجھا چکے لیکن اسکی سرکشی اور زیادہ ہوتی گئی پس جبکہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو فرعون کے ایمان لانیکی کوئی توقع باقی نہ رہی تب ان دونوں نے اسکی ہلاکت کیواسطے دعا رکی جسکا جواب خدا نے یہ دیا کہ قد اجیبت دعوتکما یعنی تم دونوں کی دعار کو ہمنے قبول کیا۔ لیکن تم لوگ صبر و استقلال پر قایم رہو اور جاہلوں کا طریقہ مت اختیار کرو کیونکہ جاہلوں کا دستور یہ ہی کہ فی الفور مقصد پورا ہو جائیگا۔

حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جسوقت دعار قبول ہو اُسی وقت مقصد بھی حاصل ہو جاوے۔ بلکہ کبھی خداوند عالم کسی مصلحت کی بناپر تاثیر دعا کو دیر کے بعد ظاہر کرتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ داعی کو دعار کا ثمرہ آخرت میں ملتا ہی۔ الغرض اجابت دعار کو یہ بات لازم نہیں ہی کہ فی الفور اسکا نتیجہ بھی ظاہر ہوا کرے۔ دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا مقبول تو ہوئی لیکن اثر اسکا چالیس برس کے بعد ظاہر ہوا۔ اور بعد قبولیت دعا کہ چالیس برس تک فرعون چین سے زندہ رہا اور ہلاک نہیں کیا گیا۔ اور ہملوگ باوجودیکہ سراپا غرق گناہ ہیں۔ اور اسیطرح یہ کہ ہماری دعاؤں میں اجابت کی بہت سی شرطیں بھی مفقود ہوتی ہیں مگر کیفیت یہ ہے کہ جس کسی کے ظہور تاثیر دعا میں اگر برس چھ مہینہ کی دیر ہوئی بس فوراً زبان سے شکوہ

نکل جاتا ہے کہ خدا بھی نہیں سنتا ہے۔ اور اگر کسی ولی یا شیخ سے دعا کرائی
گئی تھی اور کسی مصلحت سے ظہور اثر میں دیری ہوئی بس اس بزرگ سے بھی
بد اعتقادی کر جاتے ہیں کہ فلان شخص نے روز کی دوکان لگائی ہے اسمیں
کچھہ کمال نہیں ہے۔ اجی انھوں نے مثلاً میرے مقدمہ کے واسطے دعا کی اور
اس پر سرسبزی نہ ہوئی۔ حالانکہ اس معاملہ میں عجلت پسندوں کو خدا نے جاہل
قرار دیا ہے۔ لیکن افسوس تو اس امر کا ہے کہ مسلمان قرآن سے اسقدر غافل
ہیں کہ انھیں معلوم نہیں کہ قرآن میں لکھا گیا ہے۔ چونکہ عوام اس عیب میں
زیادہ مبتلا ہیں۔ لہذا اس آیت کے متعلق ہمنے اس مضمون کی تشریح مناسب
سمجھکر گذارش کیا۔ اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک

قال عز اسمہ فلولا کانت قریتہ امنت فنفعہا ایمانہا الا
قوم یونس الآیۃ (سورہ یونس) واضح ہو کہ قرآن مجید میں ہر جگہ لفظ لولا
بمعنی ھلا مستعمل ہے مگر دو جگہ ایک تو اس آیت میں اور دوسری جگہ فلو
لا کان من القرون الخ میں پس اب اس آیت کا معنی یہ ہوا کہ کوئی اہل
قریہ ایسا نہیں ہے کہ جس کو علامات عذاب کے دیکھنے پر ایمان لانا مفید
ہوا ہو۔ سوائے قوم یونس علیہ السلام کے۔

قال عز اسمہ قالو یا شعیب ما نفقہ کثیراً مما تقول (سورہ ہود)
گرچہ وہ سب حضرت شعیب علیہ السلام کے اہل زبان تھے۔ مگر بوجہ شدت
عداوت کے وہ ان کی گفتگو اور مواعظ کو سنتے نہیں تھے اور جو شخص سنتے
نہیں تو وہ سمجھے کیا۔

قال عز اسمہ یوم یات لا تکلم نفس الا باذنہ (ج) فمنہم شقی
وسعید۔ (سورہ ہود) یعنی قیامت کے دن کسی کو بلا اجازت بولنے

کا اختیار نہو گا۔ اس مضمون کی مختلف آیتیں ہیں جسمیں بظاہر کچھ اختلاف
معلوم ہوتا ہی لیکن واقعہ یوں ہی کہ قیامت کا دن بمقدار پچاس ہزار برس
کے ہو گا۔ اور اسمیں اہل محشر کو مختلف اوقات میں مختلف حالتیں پیش آویگی
کسی جگہ انسان کو بولنے کی اجازت دیجاویگی۔ اور کسی موقعہ پر وہ تحیر
اور سکوت میں رہیگا۔ کسی وقت وہ عذر کریگا۔ کسی موقعہ پر ایک دوسرے
سے سوال و گفتگو کرین گے۔ الغرض قرآن نے ہر ہر مواقعات کے متعلق
خبر دی ہے لہذا ایک آیت کو دوسری آیت سے ہرگز تعارض نہیں ہی۔

قال عز اسمہ فاما الذین شقوا ففی النار لھم فیھا زفیر
و شھیق ۝ خالدین فیھا مادامت السموات والارض
الا ماشاء ربك ان ربك فعال لما یرید ۝ (سورہ ھود)

ترجمہ:۔ جہنمی جہنم میں چیختے اور چلاتے رہین گے۔ جب تک کہ آسمان اور زمین
باقی ہی۔ مگر جو چاہے تیرا رب۔ تحقیق کے خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ تو معلوم
ہے کہ دوزخ میں دو قسم کے آدمی داخل ہونگے۔ ایک فاسق دوسرا کافر۔ اب
اس آیت میں جو لفظ الا سے استثنار ہے تو نزدیک جمہور کے فساق مومنین
اس سے مراد ہین لیکن بعضون نے کفار و مشرکین کو اس سے مستثنیٰ قرار
دیا ہے۔ اور منجملہ اور دلیلوں کے وہ ایک دلیل اسی آیت کو پیش کرتے ہین،
اور کہتے ہیں کہ کفار کا جرم متناہی ہے۔ لہذا اسکی سزا غیر منقطع اور غیر
متناہی کیونکر ہوگی۔ اور دوسری دلیل اسکی لابثین فیھا احقابا
لا یذوقون فیھا بردا ولا شرابا ہے اس طور پر کہ اگرچہ احقاب
ایک نہایت طویل و دراز مدت کا نام ہے۔ لیکن پھر بھی تو اس کی کوئی نہ
کوئی حد نہایت ضرور ہی۔ چونکہ جمہور مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ کفار

ومشرکین کا عذاب دائمی اور غیر متناہی ہے۔ لہذا ان اعتراضات مذکورہ کا
کا جواب یوں دیا جاتا ہے کہ اس آیت میں مادامت السموات والارض سے دنیاوی
آسمان اور زمین مراد نہیں ہے جو یہ سمجھا جاوے کہ چونکہ یہ آسمان و زمین ایک
وقت منقطع ہونیوالا ہے۔ لہذا کفار کا عذاب بھی منقطع ہو جانیوالا ہے بلکہ یہاں پر
اخروی آسمان و زمین مراد ہے جیسا کہ یوم تبدل الارض غیر الارض
والسموات سے وجود سمجھا جاتا ہے۔ اور اس اخروی آسمان اور زمین کے
انقطاع کی کوئی خبر نہیں ہے۔ لہذا کفار کے انقطاع عذاب کی بھی کوئی خبر
نہیں ہے۔ اور اگر ہمنے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس آیت میں یہی دنیاوی آسمان و زمین
مراد ہیں۔ لیکن اسوقت بھی جمہور کو کوئی مضر نہیں ہے۔ کیونکہ اسوقت مطلب یہ
ہوگا۔ کہ جب تک آسمان و زمین باقی ہے۔ اتنی مدت تک تو کفار بالیقین
عذاب میں ہونگے لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ جب یہ شرط نہ ہوگی
اسوقت یہ معذب بھی نہ ہونگے۔ دیکھو کسی شئے کو دور سے دیکھکر یہ کہتے
ہیں کہ اگر یہ انسان ہے تو حیوان بھی ضرور ہے۔ اور جب قریب آئی تو اسے
ہمنے جب انسان پایا۔ پس لامحالہ اسکا حیوان ہونا بھی لازم سمجھا گیا۔ اور
اگر اس شئے کے قریب آنے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ انسان نہیں ہے تو
کیا تم اسکو کہہ سکتے ہو کہ وہ حیوان بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ کوئی
جانور ہو۔ پس حیوانیت متحقق ہے۔ بغیر انسانیت کے یہ تو منطق کا مسلمہ مسئلہ
ہے کہ مقدم کے نقیض کے استثناء سے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا ہے۔

اب لابثین فیہا احقابا والے شک کا جواب یہ ہے کہ بیشک کفار
پر کیک احقاب تک اس قسم کا عذاب ہوگا کہ جس میں سوائے پیپ اور
خون کے دوسری غذا ان کو نہ میسر ہوگی۔ پھر عذاب کی کیفیت بدل جاویگی

اور دوسرے قسم کا عذاب ان پر ہوگا جسمیں ممکن ہے کہ شجرہ زقوم سے انکو غذا دیجاوے یا وہ عذاب زمہریر ہو۔ الغرض عذاب تو بہر حال رہا۔ خواہ آگ ہو یا زمہریر نفس عذاب کی نفی کہاں سے نکلی اور یہی مطلب جمہور کا ہی کہ کفار اور مشرکین کو عذاب سے نجات نہیں ہی۔ قرآن میں اس مطلب کی بہت آئتیں ہیں کہ جس سے معلوم ہوتا ہی کہ مشرکوں کو جہنم سے نجات نہیں ہی۔ یریدون

ان یخرجون من النار وما هم بخارجین منها ولهم عذاب مقیم ٥ ہر چند کفار نکلنے کا ارادہ کرین گے لیکن وہ جہنم سے نکل نہ سکیں گے بلکہ ان پر پائدار عذاب ہوگا۔ نہ معلوم بعض آدمی کیوں مشرکین کے نجات پر زور دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ نے مشرکوں پر جنت کو حرام کر دیا ہے۔ چنانچہ سورہ مائدہ میں اس مضمون کو اس طرح سے بتلایا ہے کہ انه من یشرك بالله

فقد حرم الله علیه الجنته وماواہ النار وما للظالمین من انصار۔ جو شخص کے حالت شرک میں مر گیا پس تحقیق کے اللہ نے جنت کو اس پر حرام کیا ہی اور ٹھکانہ اسکا جہنم ہے۔

زیادہ تحقیق اس مسئلہ کی تفسیر کبیر میں ملیگی۔ لیکن ایک بات قابل غور ہے کہ اما الذین سعدو ففی الجنته خالدین فیها مادامت

السموات والارض الا ما شاء ربك ط عطاء غیر مجذوذ ٥ اسمیں بھی استثنا رہے اب اس استثنا سے کیا مراد ہی۔ کیونکہ یہ بات تو اجماع و نص سے ثابت ہی کہ جنت میں داخل ہونے کے بعد پھر کوئی نکالا نہیں جاویگا۔ گرچہ اس کے متعلق بہت توجیہ اور مطالب علما نے لکھے ہیں لیکن سب سے احسن یہ ہے کہ بعض اہل جنت ایسے بھی ہوں گے کہ انکو دخول جنت کے بعد بھی ترقی درجات کی ہوا کریگی اور ایک درجہ سے

نکلکر دوسرے اعلیٰ درجہ میں داخل ہوا کرینگے۔ حتیٰ کہ عرش تک بھی کسی کی رسائی ہوا کریگی۔ اسی حالت عروج کا راز کا اس لفظ الآبین مخفی ہے۔ علاوہ ان کے مومن کے بر عدم اخراج عن الجنۃ پر دال خود اس آیت میں لفظ عطاء غیر مجذوذ موجود ہے۔

قال عز اسمہ اقم الصلوٰۃ طرفی النہار وزلفا من اللیل ان الحسنات یذھبن السیأت ذلک ذکریٰ للذاکرین۔ (سورۂ ھود) یعنی قائم کرو نماز کو دنکے دونوں کنارہ میں اور تھوڑی رات گئے پر۔ اکثر مخالفین اسلام کے یہ جاہلانہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم اتنی ناکمل ہے کہ اسمیں اسلام کے سب سے اہم حکم ادا نماز کی بھی تعین اوقات نہیں ہے۔ اور نہ قرآن سے تعین رکعات نماز معلوم ہو سکتا ہے۔ جسکا سب سے پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہمکو قرآن نے حکم دیا ہے کہ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ یعنی اے مومنو ہمنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو تمھارے واسطے نمونہ عمل بنا کر بھیجا ہے۔ ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھو یعنی رسول جو کہیں اوسکو کرو۔ اور وہ جس سے منع کریں اس سے باز رہو۔ ان احکام کے ہوتے ہوئے اب طریق عمل میں مسلمانوں کو جستجو اور تلاش کی ضرورت نہ رہی بلکہ جس عبادت کو جس طریقہ سے سرکار نے بجالایا ہے۔ غلاموں کو اسی طریقہ پر بجالانیکا طریقہ قرآن نے بتایا ہے۔ لہذا مسلمان جس طور سے نماز ادا کر رہا ہے۔ یہ عین حکم قرآن ہے۔ اور بیشک قرآن پاک میں ان احکام کی تفصیل موجود ہے۔ قرآن اس کے بیان سے قاصر نہیں ہے۔ قرآن مجید ایک مکمل اور پُر معنی کتاب ہی ہے۔ اسکا یہ خاص اعجاز ہے کہ اسکا ہر حرف بھی اپنے اندر ایک اسرار رکھتا ہے۔ بلکہ اہل نظر کو اسکا ایک ایک نقطہ بھی بحر معنی نظر آتا ہے

چند ہم معنی اور مشترک الفاظ سے جب کسی لفظ کو قرآن نے اپنے کسی موقع پر لایا ہے تو اسکا یہ انتخاب بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ دوسرا لفظ اس معنی والا اگر وہاں پر رکھا جاوے تو اسکی خوبی و اعجاز میں وہ یقیناً قاصر ہو جاتا ہے صرف ان الفاظ ظاہری پر اس کے رموز موقوف نہیں ہیں بلکہ اسمیں صفائی باطنی کا کتنا دریا موجزن ہے کہ جس کا جاننا اور سمجھنا ہر آدمی کا کام نہیں ہے چنانچہ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

حرف قرآن را بدان کہ ظاہر ست — زیر ظاہر باطنے ہم قاہر ست
زیر آن باطن یکے بطن دگر — خیرہ گردد اندرو فکر و نظر
زیر آن باطن یکے بطن سوم — کہ دروگردد خردہا جملہ گم
بطن چارم از نبی خود کس ندید — جز خدائے بے نظیر و بے ندید
ہمچنین تا ہفت بطن اے بو الکرم — می شمر تو زین حدیث اے معتصم
تو ز قرآن اے پسر ظاہر مبین — دیو آدم را نہ بیند غیر طین

قرآن کی فصاحت اور جامعیت کا حال تو اس سے معلوم ہو گیا۔ مگر چونکہ آریہ کے ان اعتراضوں سے کمزور عقیدہ کے مسلمانوں کو بھی کچھ تردد ہو جاتا ہے۔ لہذا بطور نمونہ کے ہم اسی آیت سے تعین اوقات و تعین رکعات نماز کو بتلاتے ہیں۔ لفظ طرفی النہار سے نماز فجر اور مغرب کا وقت تو معلوم ہوا۔ کیونکہ ان کے دونوں سرے پر نماز پڑھنے کا حکم ہے جسمیں ایک کا نام فجر اور دوسرے کا مغرب ہے۔ اور زلفی من اللیل سے نماز عشا کیونکہ تھوڑی رات جانے پر اسی کا وقت ہے۔ اور حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطی سے ظہر اور عصر کی نماز کا ثبوت موجود ہے کیونکہ اہل عرب ظہر اور عصر کی نماز کو صلوۃ وسطی بولتے ہیں۔ اوقات پنجگانہ اس آیت قرآنی سے ثابت ہوئے۔ علاوہ

اس کے تعین اوقات کے متعلق تو آئیتیں اس سے زیادہ واضح قرآن میں موجود ہیں۔ لیکن مینے اسی آیت کو مثالاً کیوں پیش کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسمیں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس آیت میں اوقات نماز کو ایسے پُر اعجاز الفاظ سے بتایا گیا ہے کہ جن الفاظ کی ہئیت ترکیبی اور صورت کتابت ہر وقت کے رکعات کی تعداد بھی بتلا رہی ہے۔ مثلاً فجر اور مغرب کے واسطے لفظ طرفی اختیار کیا گیا جو در اصل طرفین ہے۔ حرف نون اسجگہ بوجہ اضافت کے ساقط ہوگیا ہی۔ اب اسکی کتابت اس طریقہ سے ہوا کرتی ہے کہ یہ پورا لفظ دو حصہ پر شامل ہوتا ہے جسکا پہلا حصہ دو حرف پر شامل ہوتا ہے یعنی طر (ط ر) اور پچھلا حصہ تین حرفی ہے یعنی ف ی ن (فین) لہذا نماز صبح یعنی دن کے پہلے کنارہ میں مسلمانوں کے یہاں دو رکعت نماز فرض ہے۔ اور دن کے دوسرے سرے پر یعنی مغرب میں تین رکعت فرض ہے۔ چونکہ وہ دنکا دوسرا کنارہ ہے اور رات کی ابتدار غایت اور وسطی چو حرفی لفظ ہے۔ لہذا صلوۃ وسطے یعنی ظہر اور عصر میں چار رکعت فرض ہے۔ اور زلفی میں بھی چار حروف ہیں لہذا عشاء میں چار رکعت فرض ہے وقت نماز اور رکعات نماز کا ثبوت تو آپ سُن چکے اب نماز کے متعلق دوسری آیت عرض کرتا ہوں سنیئے۔

لا تجہر بصلوتك ولا تخافت بها وابتغ بين ذلك سبيلا (سورہ بنی اسرائیل) یعنی سب نمازوں کو بلند آواز سے مت پڑھو اور نہ سب کو آہستہ ادا کرو۔ بلکہ دونوں طرح یعنی سرّی اور جہری دونوں طرح سے ادا نماز کی ہدایت اس آیت میں کی گئی ہے لیکن نمازیں پانچ ہیں جسمیں تین وقت کی جہری ہے اور دو وقت کی سرّی شاید کسی کور باطن دشمن دین کو یہ شبہ ہو کہ یہ ترجیح بلا مرجح کیسی وجہ ترجیح یہ ہے کہ لفظ جہر سہ حرفی ہے۔ لہذا نماز جہر کے ساتھ تین وقت

ہوئی اور لفظ سر دو حرفی ہے۔ لہذا نماز با سر دو وقت پڑھی جاتی ہے۔ اور ظہر و عصر کو سری نماز کے لیئے متعین کرنے کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ ان دونوں نمازوں کے ادا کا وقت دن کے ایسے حصہ میں آتا ہے کہ جبوقت کار بار دنیا کا ہنگامہ شور عروج پر ہوتا ہے اور ایسے حال میں آہستہ پڑھنے سے قلب میں یکسوئی اور ترتیل کا موقع زیادہ ملتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ عوام کے قلوب تو اسوقت روزگار کیطرف مائل رہتے ہیں۔ اور میرے یہاں قرآن کا سننا فرض ہے کیونکہ اذا قری القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا نص صریح ہے اب اگر اسوقت امام نے زور سے قرأت پڑھی تو جس مصلّی نے کامل غور سے اسکو نہ سنا وہ گناہگار ہو گیا۔ اسی لیئے اسوقت آہستہ پڑھتے ہیں۔ اور باقی اوقات چونکہ اطمینان کے ہیں لہذا انمیں نماز بالجہر ادا کیجاتی ہے۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ نماز جمعہ بھی تو ظہر کے وقت ادا کیجاتی ہے۔ پھر اسکو بلند آواز سے کیوں پڑھتے ہیں تو اسکا جواب یہ ہے کہ اولاً اسوقت کاروبار دنیا اور نماز تک بند کر دینے کا حکم ہے۔ اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الی ذکر اللہ وذروا البیع لہذا جبکہ بائع مشتری سب اسی شغل میں ہیں تو پھر انتشار خیالات کی کوئی وجہ نہیں ہے اور دوسرے یہ ہے کہ یہ نماز ہفتہ میں ایک مرتبہ پڑھی جاتی ہے۔ اور تنہا پڑھنا جائز بھی نہیں ہے اور اس لیئے بعض وہ آدمی جو کہ بوجہ سکونت قریہ وغیرہ یا بعد مکانی یا اپنی سستی و غفلت کے پنجگانہ نماز میں جماعت کی شرکت نہیں کرتا ہے ایسا شخص بھی جملہ میں آتا ہے۔ انھیں وجہوں سے اسکو زور سے پڑھتے ہیں تاکہ ہر شخص کو قرأت فی الصلوٰۃ کا طریقہ معلوم ہو جاوے۔ اور قرآن کو امام سے سنکر جو قرأت پسند آوے اسکو حاصل کرنیکا شوق بھی پیدا ہو۔ دوسری جہر نماز

متعلق جماعت ہے اسکو قرآن نے وارکعوا مع الراکعین کے ضمن میں بتلایا ہے
بلکہ بوجہ غایت اہمیت جماعت کے حالت خوف و میدان جنگ میں بھی اسکے
پابندی کا طریقہ قرآن میں مذکور ہے۔ چونکہ سفر اور حضر کے نمازوں کی حالت
علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے۔ لہذا مرض و قصر کے مضمون میں بھی اذا ضربتم
فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ناطق ہے پھر
چونکہ حالت مرض و صحت و شدت مرض میں ادا نماز کی مختلف صورتیں ہیں کیونکہ
ہمیشہ انسان قیام کی قدرت نہیں رکھتا ہے۔ لھذا الذین یذکرون اللہ
قیاما و قعوداً و علیٰ جنوبھم کہکر ان مواقع کیطرف بھی اشارہ کردیا۔
اور نماز جمعہ میں ایک خاص اہمیت ہے لہذا یاایھا الذین اٰمنوا اذا نودی
للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ میں اسکی فرضیت کو علیحدہ طور سے بیان کی گئی
خلاصہ یہ کہ قرآن مجید ایک ایسی سراپا اعجاز کتاب ہے کہ جسکا ہر جملہ اور ہر
ہر لفظ بلکہ ہر ہر حرف اور ہر ایک نقطہ اسرار و نکات سے بھرا ہے۔ تن ز جان
و جان ز تن مستور نیست + لیک کس را دید جان دستور نیست + ہاں منکرین
اسلام اور ہٹ دھرموں کو اسمیں کوئی خوبی نظر نہیں آتی ہے ورنہ اس کے
اعجاز سے انکار کرنا غیر ممکن ہے۔ دیکھو جبکہ اس ہیچمداں کو اس ایک آیت کے
اندر باعتبار لفظ اور بلحاظ صورت کتابت اور باعتبار نقطہ وغیرہ کے کتنی
باتیں اسمیں معلوم ہوئی ہیں جسکا تھوڑا سا نمونہ ہمنے ابھی آپ کو اسی بحث
کے ضمن میں سنایا تو بھلا علماء راسخین کو کیا کیا نہ اسمیں ملتا ہوگا اور خلفاء
راشدین و صحابہ کرام و ائمہ مجتہدین کو کسقدر بیش بہا جواہر اس خزانہ سے ملے
ہیں وہ تو ہماری سمجھ سے باہر ہے ؎

مخدرات سراپردہ ہائے قرآنی — چہ دلبر اند کہ دل می برند پنہانی

اور وہ انوار اور نکات قرآنی جو کہ اہلبیت علیہم السلام کے حصہ کی خاص چیز تھی اسکی عظمت اور کثرت کا اس سے قیاس ہو سکتا ہے کہ حضرات حسنین علیہم السلام کو ابتداءً تو سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ نعمت دی اور اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہ نے اسرار و رموز قرآن کے انمول جواہر صاحبزادوں کو دینا شروع کیا تو باوجودیکہ معلم اور متعلم دونوں اولوالعزم تھے او پیر انکو دیتے دیتے اور انہوں کو لیتے لیتے ۲۹ برس سے کچھ زیادہ مدت درکار ہوئی بتائیے ایسے بحر ذخار میں ہر شخص کی کہاں چل بن سکتی ہے۔ اسی لیئے تیرہ سو برس سے آجتک تمام دنیا کے بیدینوں کا جواب ایک قرآن سے دیا جا رہا ہے

واضح ہو کہ ناظرین کی معلومات کے لیئے خطبہ جمعہ کے متعلق **حضرت پیرو مرشد مولانا سید محمد علی صاحب مدظلہ** کے رسالہ قول المحکم کا خلاصہ یہاں پر نقل کیئے دیتا ہوں وھو ہذا:۔ خطبہ کلام عرب میں وعظ اور نصیحت کو کہتے ہیں لہذا عربی زبان کے سوا دوسری زبان مثلاً فارسی یا اردو میں خطبہ پڑھنا جائز ہے، اس میں شبہ نہیں کہ عربی زبان کو دوسری زبانوں پر فضیلت ہے، اس لیئے خطبہ کا عربی میں پڑھنا افضل ہے، مگر چونکہ خطبہ کا اصل مقصود وعظ و نصیحت اور تعلیم و تذکیر ہے اور ہندوستان میں اس مقصود کا حاصل ہونا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ خطبہ اردو میں پڑھا جاوے، اس وجہ سے یہ ہونا چاہیئے کہ خطبہ میں مناسب وقت جو وعظ اور تعلیم کرنا منظور ہو وہ اسی زبان میں بیان کیا جاوے جسکو حاضرین سمجھتے ہوں، بقیہ مضمون خطبہ کا عربی میں ہو تا کہ خطبہ کا اصل مقصود بھی فوت نہ ہو اور حتی الوسع زبان عربی کی فضیلت بھی حاصل ہو جاوے، اس وقت میں اس کی زیادہ ضرورت اس وجہ سے بھی ہے کہ اب مسلمانوں کو دینی امور کی طرف توجہ کم ہے، سیدھے وعظ کو کم سنتے ہیں بلکہ مناد پڑھکر راستہ لیتے ہیں، اس لیئے خطبہ میں ضروری ہدایتیں حاضرین کی زبان میں کر دینا ہر طرح سے

مناسب ہے، اور کئی طریقون سے کتب فقہ سے اس کے جواز کا ثبوت ملتا ہے مثلاً محیط
مین ہے :- لو خطب بالفارسیة جاز عند ابی حنیفة علی کل حال یعنی
اگر پورا خطبہ فارسی مین پڑھا جاوے تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر حال مین جائز
ہے خواہ امام عربی مین پڑھ سکے، خواہ اس کی صلاحیت نہ رکھتا ہو انتہی ملخصاً قال عز اسمہ
وما کان ربک لیہلک القری بظلم واہلہا مصلحون سورہ ہود
یعنی صرف شرک کی وجہ سے خدا کسی قوم کو ہلاک نہین کرتا ہے، جب تک کہ وہ لوگ معاملات
مین اچھے نہ ہون، ہان اگر آپس کے معاملات مین فساد آگیا اور بے ایمانی اور حق تلفی
جس قوم مین شروع ہوگئی ہو تو البتہ اس وقت اس بد معاملہ قوم کو ہلاک کرنے کے لیے غضب
الٰہی کا ظہور ہوتا ہے، اس سے معاملات کی اہمیت کو سمجھو، مگر آجکل معاملات کا حال سب پر
روشن ہے قال عز اسمہ لقد ہمت بہ وہم بہا لولا ان رأ برہان ربہ
(سورہ یوسف) یعنی زلیخا نے برائی کا ارادہ ظاہر کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام بھی اظہار
ارادہ کرتے اگر نہین دیکھتے برہان خدا کو، عام طور سے یہ مشہور ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام
کا بھی برا ارادہ ہوا تھا، لیکن خدا نے باز رکھا، لیکن عقل سلیم جب اس امر مین غور کرتی
ہے کہ عزیز مصر حضرت یوسف ع کا محسن تھا، اور محسن کی زوجہ کی طرف بنظر خیانت دیکھنا
بھی ایسا قبیح امر ہے کہ جس سے فاسق کو بھی احتیاط اور پرہیز ہے، چہ جائیکہ ایک
نبی صدیق کی طرف ایسا باطل ارادہ منسوب کیا جاوے، کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام
کی شان معصومیت کا تقاضا یہ ہے کہ کبائر کا ارادہ بھی ان سے صادر نہین ہوتا ہے، اس لیے
علماء محققین کے خیالات کا خلاصہ ہم اس جگہ اپنے ناظرین کی خدمت مین پیش کرتے ہین
واضح ہو کہ ہم کے معنی بیشک یہی ہے کہ ارادہ کیا، اب ہر شخص کے شایان شان جیسا
ارادہ ہو، اس کو اس کی طرف منسوب کرنا چاہیے پس ہمت بہ کا مطلب تو یہ ہے
کہ زلیخا نے برائی کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور حضرت یوسف ع نے جب اس عورت کو نافرمان

پایا تو ہم بہا یعنی آپ نے یہ ارادہ کیا کہ اس گنہگار عورت کی سزا کرون۔ اور یہی ارادہ منصب نبوت کے استحقاق والے کے لائق شان تھا اور قریب تھا کہ آپ اس کو مار ڈالتے اگر نہ دیکھتے برہان رب کو یعنی عین اس وقت جبکہ آپ اسکو سزا دینے پر بالکل آمادہ ہو چکے تھے، خدا نے منع کر دیا، کیونکہ اس وقت یہ کام خلاف مصلحت تھا، اس لئے کہ زلیخا صاحب حکومت تھی، ممکن تھا کہ وہ آپکو قتل کرا دیتی تو جو امور آپ سے متعلق تھے اس کا ظہور کیونکر ہوتا، مثلاً منصب نبوت یا حکومت مصر و انتظام قحط وغیرہ وغیرہ، اس لئے آپ وہان سے نکل آئے اور کسی کا ارادہ پورا نہ ہوا۔

شعر الراقم سه

میری انکی گفتگو کا تھا فقط سامع چراغ ۔ بیچارگی آپکی تھی پر ہوا مانع جیسے چراغ

یعنی وہ نور نبوت جو حضرت یوسف علیہ السلام سے متعلق ہونیوالا تھا وہ ایسا مانع ہو گیا کہ باوجودیکہ اس موقعہ پر حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے سوا دوسرا کوئی شمع اور فانوس کے سوا نہین تھا، مگر وہ چراغ نور ایمان کا جو کہ حضرت یوسف ہے کے قلب مین روشن تھا وہ ایسا مانع ہوا کہ زلیخا کا ارادہ پورا نہ ہو سکا اور وہ بے نیل مرام رہ گئی، آخر اپنی اس ناکامی کا انتقام زلیخا نے اس صورت سے لیا کہ آپکو قید کر دیا۔

قال عز اسمہ اجعلنی علی خزائن الارض انی حفیظ علیم ؕ (سورۂ یوسف) گرچہ طلب امارت ممنوع ہے۔ مگر چونکہ حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ السلام پر امور خلق مین تصرف کرنا واجب تھا اور اس وقت اسکا وہی ذریعہ تھا لہٰذا ان کے حق مین یہ طلب حکومت جائز اور مستحسن ہے، جیسے حضرت سلیمان کی دعا رب ہبلی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی کہ سلیمان علیہ السلام کو تو زیبا تھی مگر دوسرون کو ایسی دعا کرنی ناجائز ہے کیونکہ اس میں ایک قسم کا حسد پایا جاتا ہے خواص کے معاملات عوام سے علیحدہ ہین۔ بعض آدمی ایسے ہوتے ہین کہ انبیا علیہم السلام یا اولیا کرام کی مخصوص باتون کی تہ تک کو پہونچتے نہیں ہین مگر اپنے

افعال کو ان حضرات کے افعال پر قیاس کرتے ہین جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ شیطان ان کی رہزنی بہت آسانی سے کر لیتا ہی۔

قال عز اسمہٗ ۔ یا بنی لا تدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقۃ وما اغنی عنکم من اللہ شیئا (سورۂ یوسف) یعنی اے میرے لڑکو تم سب ایک دروازہ سے مت جانا بلکہ متفرق دروازون سے اور حالانکہ مین تقدیر کو ٹال نہین سکتا ہون اکثر مفسرین کی رائے یہ ہی کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے لڑکون کو ایسی صلاح بغرض استحفاظ نظر بد کے دی تھی اور اسی سے نظر بد کا ثبوت لیتے ہین اور یہ فعل حضرت یعقوب علیہ السلام کا توکل مع التدبیر پر مبنی تھا اور صوفیائے کرام اس کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی عظمت کے مقابلہ مین چندان پسند نہین کرتے ہین کیونکہ وانما بنعمۃ ربک فحدث کے مقابلہ مین نبی کیونکر اپنے اس احسان خدا کو جو کہ ان پر بذریعہ اعطار گیارہ بیٹون کے ہوا تھا کتمان نعمت کر سکتے تھے بلکہ ان بزرگون نے اس کا مطلب یہ لکھا ہی کہ جب ابناء یعقوبؑ ان سے رخصت ہو کر آنے لگے تو اپنے لڑکون کو یہ وصیت فرمائی کہ دیکھو ایسا نہ ہو کہ ابواب خیرات کے ایک ہی دروازہ سے تم داخل جنت ہونا چاہو مثلاً فقط نماز یا صرف روزہ اور دوسرے دروازون سے تم غفلت مت کرو کیونکہ یہ نہایت مضر اور بے سود ہی چونکہ ذات احدیت منشار ہی جمیع فضائل کا اور مبدار ہی جمیع صفات حسنہ کا بس سالک کو لازم ہی کہ ابواب حسنات کے سب دروازون کی سیر کرے اور فضائل متفرقہ کی تحصیل کرے تا کہ موصوف بالعدالت ہو کر اپنے کو اس قابل بناوے کہ اس کا حجاب دور ہو جاوے اور وہ جنت میں پہونچ سکے وما اغنی عنکم من اللہ شیئا یعنی اے لڑکو مین تمہارے لئے صرف ایک تجربہ کار مشیر ہون ورنہ اگر تم لوگون کے ساتھ توفیق الٰہی شامل نہوئی اور تم نے میرے قول پر عمل نہ کیا جس کی وجہ سے تم محجوب رہ گئے تو یاد رکھو کہ ما اغنی عنکم من اللہ شیئا یعنی ہم تمہاری کوئی چارہ جوئی نہین کر سکتے ہین اور نہ تم کو

میرے رشتہ سے نفع پہونچیگا کیونکہ کلّ نفسٍ بما کسبت رہین شرافت نسبی بغیر عمل کے کچھ نافع نہوگی ؎ اے بسا مہتر پسر کز شور و شر ٭ شد ز فعل زشت خود ننگ پدر

مختصر یہ ہو کہ صرف ایک ہی قسم کی نیکی حصول نجات کے لئے کافی نہین ہو کیونکہ صرف ایک ستون پر بقاے چھت دشوار ہے یا کسی گاڑی سے اگر ایک پہیّا کو علیحدہ کردو اور دوسرا خواہ کتنا ہی مضبوط اور خوبصورت واعلے درجہ کی ساخت کا ہو مگر اس گاڑی کا منزل تک پہونچنا مشکل ہو غالبًا اسی بنیاد پر شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا ہو ؎ بخیل ار بود زاہد بحر و بر ٭ بہشتی نباشد ز حکم خبر - یعنی بخیل گرچہ نہایت عابد و شب خیز بلکہ شب بیدار کیون نہ ہو مگر چونکہ اس نے باب الجود مین داخل ہونے کی کوشش نہین کی ہو لہذا اس کا حجاب باقی ہو اور چونکہ مال کی محبت اس کو اللہ کی محبت پر غالب ہو لہذا اس کو اللہ سے نہایت دوری ہو کیونکہ قران نے خود یہ فیصلہ کر دیا ہو لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون ہرگز تم لوگ اللہ کی قربت حاصل نہین کر سکتے ہو جب تک اس کی راہ مین پیاری چیز کو خرچ نہ کروگے، بتائیے کہ ایک پہیّا کی گاڑی بخیل کو جنت کیونکر پہونچا سکتی ہو - تحریر رسالہ ہذا سے قبل تک مجھے خود سعدیؒ کے اس شعر مین تردد تھا -

قال عز اسمہٗ ایتها العیر انکم لسارقون (سورۂ یوسف) ممکن ہو کہ منادی نے اس ندا کو بطور استفہام بیان کیا ہو - پس نہ جرم ہے اور نہ کذب - واللہ اعلم بالصواب -

قال عز اسمہٗ - وخروا لہٗ سجدًا (سورۂ یوسف) یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹون نے سجدہ کیا اس کا مطلب محققانہ اور خالی عن المفاسد تو یہ ہے کہ جب اتنے عرصہ کے بعد باپ بیٹا اور بھائیون مین حضرت یوسف علیہ السلام کے یکجائی ہوئی تو سبھون نے خوش ہوکر بارگاہ صمدیت مین سجدۂ شکر بجا لایا

اب اس توجیہ پر صرف ایک شبہہ یہ ہوتا ہے کہ لہٗ کی ضمیر کا مرجع لفظ اللہ کیونکر ہی کیونکہ اس آیت میں قبل لہٗ کے لفظ اللہ نہین مذکور ہے اور اگر وہ لفظ رب جو کہ قد جعلہٗ ربی حقا میں ہی مرجع بنایا جاوے تو اضمار قبل الذکر لازم آتا ہی جواب اسکا یہ ہے کہ لہٗ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہو سکتی ہی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر دلون میں موجود ہے۔ پس اسی قرینہ قویہ کے ہوتے ہوئے مرجع کو لفظاً ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی چنانچہ ملا مبین لکھتے ہیں کہ سبحانہٗ ما اعظم شانہٗ الضمیر یرجع الی اللہ لکونہٖ مضمراً فی الضمائر۔ ہان اگر کوئی یہ کہے کہ آگے چل کر مذکور ہے کہ ہذا تاویل رویای من قبل قد جعلہا ربی حقا یعنی حضرت یوسفؑ نے کہا کہ یہ میرے خواب کی تعبیر ہی جس کو خدا نے سچ کر دکھایا اور خواب تھا رایتہم لی ساجدین۔ بر بناء لام تخصیصہ کے مسجود حضرت یوسفؑ ہون تب تو لام کا فائدہ بھی باقی رہتا ہی اور تعبیر بھی پوری ہوتی ہی۔ جس کا جواب یہ ہی کہ قرآن مین لام ہمیشہ واسطے تخصیص کے مستعمل نہیں ہی کبھی غیر تخصیص مین بھی مستعمل ہی جیسا کہ اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس مین۔ چونکہ ظہور تعبیر کے وقت اس سجدۂ شکر کا سبب وصال یوسف تھا پس اسی مناسبت سے وہان رایتہم لی کہا گیا مگر عام طور سے لہٗ کا مرجع حضرت یوسف کو قرار دیا جاتا ہی اور آپکو مسجود مانا گیا ہی اور یہ سجدہ تعظیمی مراد لیا گیا ہی چنانچہ اسی بناء پر ہندوستان کے ایک مشہور اہل قلم نے ایک رسالہ بھی سجدہ تعظیمی کے جواز پر تحریر کیا ہی جسمیں کتاب و سنت و فقہ و اصول فقہ و افعال بزرگان دین سے اس کو مباح ثابت کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہی جس کا خلاصہ یہ ہی۔ کہ

حضرت آدم اور حضرت یوسف علیہما السلام کے مسجود ہونے کی خبر قرآن مجید مے ثابت ہی اور ہم کو اس سے منع نہین کیا گیا تو اس قاعدہ کی بناء پر سجدہ تعظیمی

ہمارے لئے شریعت الٰہی ہے کیونکہ یہ سجود از قبیل اخبار ہیں نہ از قسم احکام اور اخبار منسوخ نہیں ہوا کرتے ہیں جیسا کہ نور الانوار حسامی توضیح کتب اصول فقہ مین اس کی تصریح موجود ہے۔ کہ النسخ انما یکون فی الاحکام دون الاخبار پس قران مجید سے سجدہ تعظیمی کا صاف اور صریح لفظون مین جواز ثابت ہے۔

اب راقم الحروف یہ عرض کرتا ہے کہ اولاً تو قرآن مجید سے متفقہ طور پر یہ ثابت نہین ہے کہ در حقیقت سجدہ آدم اور سجدہ یوسف علیہما السلام میں مسجود کون ہے یہی دونون مسجود تھے یا خدا کیونکہ جب مسلمانون کی ایک جماعت نے سجدہ ملائکہ مین حضرت آدم کو مثل قبلہ کے قرار دیا ہے تو حضرت آدم کی مسجودیت پر اجماع نہین رہا اور سجدہ یوسف کو بعضون نے جب سجدہ شکر کہا ہے تو اس لحاظ سے یہ بھی متفقہ طور پر ثابت نہین ہوتا ہے پس اگر قران مجید سے صاف اور صریح لفظون مین ثابت ہوتا تو یہ اختلاف کیون باقی رہتا۔ اچھا اگر ہم ان تحقیقات اور اختلافات سے قطع نظر بھی کرلین تب بھی قران مجید سے جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ قصہ آدم علیہ السلام مین نبی مسجود اور ملائکہ ساجد اور قصہ یوسف علیہ السلام میں نبی مسجود اور نبی ساجد یا چونکہ برادران یوسف کی نبوت مین اختلاف ہے لہذا یون سمجھے کہ نبی مسجود اور غیر نبی بمعیت نبی کے ساجد۔ بہر حال مسجودیت کا ثبوت اگر ہے تو نبی کیلئے اور غالباً معترز مؤلف قران مجید سے ایسی کوئی آیت نہین پیش کرسکینگے کہ جس مین مسجود سجدہ تعظیمی کا اور ساجد دونون غیر نبی ہو۔ پھر غیر نبی کے لئے انبیاء علیہم السلام کے مخصوصات کی اجازت دینی زیادتی علی الکتاب نہین تو اور کیا ہے کیونکہ مرشد خواہ کتنا پایہ بلند رکھتے ہون مگر وہ شریعت کی اصطلاح مین نبی نہین ہین اور نہ نبی کا درجہ پاسکتے ہین لہذا مطلقاً یہ کہدینا کہ قرآن مجید ہی صاف اور صریح لفظون مین جواز ثابت ہے مناسب نہیں ہے بلکہ اگر کہین تو یہ کہہ سکتے

ہین کہ قرآن مجید سے نبی کے لئے سجدۂ تعظیمی کا وقوع ثابت ہے اور لاتسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ الذی خلقھن ان کنتم ایاہ تعبدون ط کو وہ صرف سجدہ عبودیت لغیر اللہ کا مانع قرار دیتے ہین اور سجدۂ تعظیمی کی ممانعت سے اس آیت کو ساکت سمجھتے ہین محض اس بنا پر کہ شمس و قمر کے سجدہ سے ممانعت کی گئی ہے اور انسان کا تو اس آیت مین ذکر بھی نہیں ہے لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ واسجدوا للہ میں لام باالاتفاق واسطے تخصیص کے ہے جس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ بغیر اللہ کا سجدہ مطلق خدا پرستون کو ممنوع ہے اور چونکہ اس وقت شمس و قمر کے پوجنے والے بکثرت موجود تھے اسی لئے شمس و قمر کا خصوصیت سے اس مین ذکر کیا گیا اور ایمان دارون کو بتایا گیا ہے کہ دیکھو ہرگز غیر خدا کو تم کسی قسم کا سجدہ نہ کرو اور انسان کی پرستش کرنیوالی جماعت یہود و نصاریٰ بھی اور مشرکین عرب اصنام کو سجدہ کرنیوالے تھے۔ لہذا حضرت عزیز و مسیح کی خدائی اور بتون کی الوہیت کی قرآن نے نہایت شدت کے ساتھ جا بجا رد کیا ہے، اب رہی یہ بات کہ اخبار قابل نسخ نہیں ہین، تو میں بھی اس کا قائل ہون کہ اخبار قابل نسخ نہین ہوتے ہین کیونکہ نسخ اخبار مستلزم ہے کذب الہی کو لہذا اخبار کا منسوخ ہونا محال ہے لیکن واضح ہو کہ بعض اخبار مین دو حیثیت ہوتی ہین ایک خبر من حیث ہو الخبریہ۔ تو بیشک باالاتفاق غیر قابل نسخ ہے۔ لہذا ہم بھی ان خبرون کو اس لحاظ سے غیر منسوخ کہتے ہین اور عقیدہ رکھتے ہین کہ حضرت آدم اور حضرت یوسف علیہما السلام کے متعلق ایسے واقعات گذرے ہین جس کی خبر قرآن نے دی ہے دوسری حیثیت یہ ہے کہ ان اخبار سے احکام بھی مستنبط ہون مگر خبر سجود میں قابلیت استنباط احکام کی نہین ہے کیونکہ اب کبھی کوئی ایسی صورت میسر نہین آسکتی ہے کہ جس مین نبی کو تعظیماً مسجود بنایا جا سکے، کیونکہ نبوت تو جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی ہے

اب اگر کسی کو مسجود لسجدہ تعظیمی بنایا جایگا تو لامحالہ وہ غیر نبی ہوگا جسکا قیاس ان انبیاء کے واقعات مخصوصہ سے قیاس مع الفارق ہے علاوہ اس کے اگر یونہی کسی ہر اخبار سے احکام لئے جاتے تو لازم تھا کہ بروز شنبہ ہم کو شکار کرنا منع ہوتا کیونکہ قران مجید نے اصحاب سبت کے متعلق یہ خبر بیان کی ہے کہ قلنا لهم لا تعدوا فی السبت اور پھر کسی آیت مین صریح اجازت ہم کو بروز شنبہ شکار کھیلنے کی نہین دی گئی۔ اور اصحاب سبت کو یہ ممانعت ابتداءً بطور سزا کے بھی نہین تھی بلکہ امتحاناً و ابتلاءً یہ حکم دیا گیا تھا البتہ بعد عدول حکمی اس کے عذاب آیا تھا۔ مگر شریعت اسلامی مین بروز شنبہ شکار کرنا ممنوع نہیں ہے اور ملاحظہ ہو قران نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق یہ خبر بیان کی ہے کہ رب ہب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی اور پھر کسی نص صریح سے ہم کو قران نے ایسی دعاء سے روکا بھی نہین تو لازم تھا کہ امت محمدیہ کے لئے ایسی دعا مانگنی مباح ہوتی لیکن ہمارے لئے اس قسم کی دعاء ممنوع ہے کیونکہ یہ خصوصیات میں سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہے اسی طرح سے ممکن ہے کہ سجودیت لسجدہ تعظیمی حضرت آدم اور یوسف علیہما السلام کے مخصوصات میں سے ہو اس کے بعد محترم مولف نے حضرت عائشہ کی ایک حدیث نقل کی ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلعم مہاجرین اور انصار کے مجمع مین تشریف رکھتے تھے کہ ایک اونٹ آیا اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم کو سجدہ کیا تب اصحابؓ نے عرض کیا کہ جب اونٹ اور درخت آپ کو سجدہ کرتے ہین تو ہم زیادہ مستحق ہین کہ آپکو سجدہ کریں۔ جس پر حضور نے فرمایا کہ انسان کو زیبا نہیں ہے کہ وہ غیر خدا کو سجدہ کرے جسکا مطلب وہ یون تحریر فرماتے ہین کہ :۔ اس حدیث مین سجدہ عبودیت لغیر اللہ کی ممانعت ہے ورنہ اگر سجدۂ تحیت سے ممانعت ہوتی تو حدیث کا ناسخ قران ہونا لازم

آتا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اونٹ کا وہ سجدہ جو اس نے حضور اکرم روحی فداکو کیا تھا سجدہ عبادت تھا۔ سجدۂ تحیت۔ سجدۂ عبودیت کہ نہیں سکتے ہین کیونکہ اس مین اولاً تو ایک گونہ بے ادبی ہے بارگاہ رسالت مین۔ اور ثانیاً مستلزم ہوگا للّٰہ یسجد من فی السموات والارض کی تکذیب یا نسخ کا۔ لہٰذا لامحالہ اونٹ کے اس سجدہ کو سجدۂ تحیت ہی قرار دینا ہوگا اور چونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عشق و محبت مین سرکار کے سرشار تھے بس اونٹ کے سجدہ تعظیمی کو دیکھکر ولولہ و شوق میں انہون نے بھی سجدہ تعظیمی کی اجازت چاہی تھی جس سے سرکار نے لاینبغی کہکر منع کردیا۔ کیا صحابہ سجدہ عبودیت کی حرمت کو نہین سمجھتے تھے جو اونٹ کے سجدہ کو سجدہ عبادت سمجھتے اور سجدہ عبادت کی اجازت حضور سے چاہتے۔ الغرض اصحاب نے جس کی اجازت چاہی تھی اس سے منع کردیا گیا پھر یہ کھول کر کہا جاتا ہے کہ سجدہ تعظیمی کے بیان سے یہ حدیث ساکت ہے سوال ہو سجدہ تعظیمی سے اور جواب میں سجدہ عبودیت کی حرمت تبلائی جائے۔ سوال از آسمان وجواب از ریسمان اسی کو کہتے ہین اب رہا فاضل مولف کا یہ شبہ کہ اگر اس حدیث کو سجدہ تحیت کے متعلق مانع قرار دین تو نسخ کتاب کا جزاحاد سے لازم آتا ہے جس کا جواب یہ ہے کہ نص صریح تو صرف دو باتون میں ہے ایک یہ کہ نبی مسجود اور ملائکہ ساجد۔ اور دوسری یہ کہ نبی مسجود اور ساجد غیر نبی بمعیت نبی جسکو مفصل ہم اوپر لکھ چکے ہین اور حدیث مانحن فیہ سے ممانعت اس صورت کی ہے کہ سجدہ تعظیمی میں صرف غیر نبی ساجد ہو اور مسجود خواہ نبی ہو یا غیر نبی۔ یا مسجود اور ساجد دونون غیر نبی ہون۔ پس یہ حکم ثبوت ما سکت منہ القرآن ہے نہ کہ نسخ کتاب کا جز احاد سے اب ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب اس حدیث سے سجدہ تعظیمی کی ممانعت ثابت

ہوئی ہی تو اونٹ نے سجدہ تعظیمی کیون کیا اہل فہم جواب اس کا خود اسی حدیث مین موجود
پاتے ہین یعنی لفظ لاینبغی لبشر یعنی احکام انسان کے اور ہین اور غیر انسان
کے احکام علٰحدہ ہین (ع) موسیا آداب دانا دیگرند - علاوہ اس کے اونٹ
کا سجدہ کرنا تو ایک معجزہ تھا سرکار دو جہان صلعم کا - غایت ما فی الباب یہ ہے کہ
سجدہ تعظیمی کا یا تو کرنا اولیٰ ہوگا یا ترک اولےٰ ہوگا - اگر بجا لانا اولی ہوتا تو اصحاب
ضرور حضور کو سجدہ تعظیمی کیا کرتے کیونکہ سرکار کی ذات اقدس سے بڑھکر اور کوئی
مخلوق واجب التعظیم نہین - اور صحابہ سے بڑھکر دوسرا کون سجدہ تحیت اور سجدہ عبودیت
کے فرق باریک کو سمجھکر ادا کرنے پر قادر ہی - جب اصحاب نے نہین کیا تو ترک
اولی سمجھا گیا لہذا منشا احتیاط یہ تھا کہ ایسے مسائل کا عوام سے تذکرہ بھی کرنا نہین
چاہیئے تھا چہ جائیکہ انہین یہ کہا جائے کہ یہ فعل جائز اور مباح ہی - مدارج النبوۃ
کی ایک حدیث سے بھی مولف نے استدلال کیا ہی کہ عکرمہ بن ابوجہل نے
آٹھوین ہجری مین اسلام لایا اور انہون نے حضور کو سجدہ کیا اور آپ نے اسکو
اس فعل سے منع نہین کیا - اس کا جواب بصورت ثبوت صحت حدیث کے یہ ہی
کہ بہت ممکن ہی کہ عکرمہ نے اسلام پانے کی خوشی مین خدا کا سجدہ شکر بجالایا ہو یا
غایت سرور و بیخودی میں حضور ہی کو سجدہ تعظیمی اسنے کیا ہو بس یہ شاذ و نادر واقعہ
ایسے شخص کا ہی جس کو مسائل اسلام سے ابتک آگاہی نہ تھی اور پھر جب اس
وقت حضور نے اس نومسلم کو شاید کسی وجہ سے منع نہ کیا ہو جیسا کہ اس رسالہ مین
مولف عالی قدر نے جتنے بزرگان دین کے واقعات لکھے ہین ان سب کو بغور پڑھنے
سے یہی معلوم ہوتا ہی کہ ان اولیاء کرام نے عالم مستی اور بیخودی و بے اختیاری مین
اپنے مرشدون کو کبھی سجدہ تعظیمی کیا ہی - یا کسی بلند پایہ بزرگ نے بحالت شکر اپنے
کسی مرید کو اس کی اجازت بھی دی ہی بس یہ فعل عوام کے واسطے موجب تعلیم

کیونکر ہوگا۔ ان بزرگان دین کو میں خود اپنا پیشوا سمجھتا ہون۔ مگر جو افعال کہ ان اولیاء ملت سے اضطرارًا بحالت ذوق و مستی صادر ہوئے ہین وہ گرچہ ان حضرات کے لیئے موجب اعتراض نہین ہین مگر پھر بھی عوام کو اس کے اتباع کا مشورہ دینا نہین چاہیئے۔ دیکھیئے احادیث سے تصویر کشی مطلقاً ممنوع ہی مگر جب فقہار نے بوجہ کسی ضرورت یا مصلحت کے ایسی تصویر کو مباح بنایا کہ جس اعضاء کے انقطاع سے زندگی نہین باقی رہتی ہو بس رفتہ رفتہ اس کا انجام یہ ہوا کہ آجکل بعض بعض مسلمانون نے اپنے مرشدون کا مجسمہ بناکر رکھ لیا ہی اور ممکن ہی کہ خدانخواستہ آئندہ نسل مین اس کی پرستش بھی ہونے لگے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ بزرگان دین کے خاص معاملات علیحدہ ہین اگر کسی کو سجدۂ تعظیمی کیا گیا یا کسی نے سبحانی ما اعظم شانی کہا ہی تو اس سے احکام شریعت مین کوئی ردوبدل نہین ہوسکتا ہی اور نہ مریدون کو اس کا کرنا لازم و زیبا ہی جس کے متعلق ہم مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ عرض کرتے ہین مولانا نے مثنوی مین فرمایا ہی آنچہ کہ ولی کامل بکند مریدان راہمان **فعل کردن نشاید کہ حلوا طبیب را زیان ندارد مگر مریض را مضر است**۔ سے فعل پاکان را قیاس از خود مگیر۔ گرچہ یکسان باشد نوشتن شیر و شیر۔ شیر آن باشد کہ مردم می خورد شیر آن باشد کہ مردم را خورد۔ نہ معلوم کس مصلحت سے انھون نے کہا ہے
در حق او مدح و در حق تو ذم + در حق او شہد در حق تو سم + در حق او نور و در حق تو نار + در حق او گل و در حق تو خار + آن انا در وقت گفتن رحمت ست + آن انا بیوقت گفتن لعنت ست + منصور کو انا الحق نے مقبول بنادیا اور فرعون نے انا اللہ کہا تو مردود ہوگیا (ع) طعمہ ہر مرغکے انجیر نیست۔ واللہ اعلم بالصواب

قال عز اسمہٗ اولٰئک الذین کفروا بربھم واولٰئک الاغلال فی اعناقھم

داولٰئک اصحاب النار ھم فیھا خالدون ﴿سورہ رعد﴾ اتنے کلمات حصر سے خلود فی النار کا ذکر کیا گیا جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جو لوگ منکر ہین بعث و نشر اور کفار ہین وہی مخلد فی النار ہون گے اور مومن فاسق مخلد فی النار نہو گا۔

قال عز اسمہ۔ وللہ یسجد من فی السمٰوات والارض طوعًا وکرھا وظلالھم بالغدو والاصال۔ ﴿سورہ رعد﴾ یعنی جتنی چیزین آسمان اور زمین مین ہین ان پر واجب ہے کہ خدا کو سجدہ کرین، اسی لئے اس وجوب کو وقوع سے ذکر کیا اب سب سے تو طوعًا اس کا صدور ہوتا ہے البتہ کفار سے بذریعہ سایہ کے کرہًا اور اسی لئے بے اختیاری کا سجدہ کوئی مفید اور دافع عذاب آخرت نہین ہے

قال عز اسمہ الذین اٰمنوا وتطمئن قلوبھم بذکر اللہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ ﴿سورہ رعد﴾ یعنے مسلمانون کا دل اللہ کے وعدہ پر مطمئن رہتا ہے اب اگر کوئی یہ کہے کہ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان نام ہے اطمینان کا اور حدیث مین ہے کہ الایمان بین الخوف والرجاء اور در حقیقت مسلمانون کے دل کی کیفیت یہی ہے کہ کبھی خوف ہے تو کبھی امید۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اس آیہ اور اس حدیث مین اختلاف نہین ہے بلکہ مسلمانون کو خوف محض اس لحاظ سے ہے کہ نہ معلوم ہم سے وہ عبادت کہ جس پر وعدہ نجات ہے ادا ہوئی ہے یا نہین۔ ورنہ نفس وعدہ یا وعید کی صداقت پر کسی مسلمانون کو بے اطمینانی ہرگز نہیں ہے۔

قال عز اسمہ اولم یروا انا نأتی الارض ننقصھا من اطرافھا ﴿سورہ رعد﴾ بعض صوفی نے مطلب ظاہری کے علاوہ ایک مطلب اس کا یہ لکھا ہے کہ کیا نہین دیکھتے ہو کہ ہم تمہاری جسمانی زمین مین کس طرح نقصان ہو جاتے ہین کہ بال کی سیاہی چلی جاتی ہے۔ دانت رخصت ہو جاتے ہین سمع و بصر مین نقصان شروع

مومن کا خوف

ہو جاتا ہی۔ اطراف میں رعشہ ہوتا ہے نسیان اعضا ہونے لگتا ہی باوجودیکہ تمہارے پاس اسباب علاج کے ہوتے ہین لیکن اپنی دولت یا حکمت وغیرہ سے جوانی کو قائم نہین رکھ سکتے بلکہ تم دیکھتے ہی رہجاتے ہو کہ بڑھاپا اپنا کام شروع کر دیتا ہی اور امیر وغریب دونون پر اس کا حملہ ہوتا ہی اور دونون اسکے مقابلہ سے مجبور ہین آخر موت آہی جاتی ہی پھر سمجھو تو کہ عذاب آخرت کو تم کیونکر دفع کر سکتے ہو اور جمہور نے جو لکھا ہی اس کی نقل کرنے کی ضرورت نہین ہی کیونکہ اس کو تو سب جانتے ہین

قال عز اسمہٗ ان الانسان لظلوم کفار ۃ (سورۂ ابراہیم) انسان تنگدستی مین تو ظالم ہے کہ وہ فریاد اور شکایت مین مشغول رہتا ہی اور خدا کی بے شمار نعمتون کو وہ اس حال مین بھول جاتا ہی اور بحالت مالداری وہ ناشکرا ہی کہ صرف تحصیل مال مین مبتلا رہتا ہی غربا اور مستحقین کے حقوق کی پرواہ نہیں کرتا ہی الا اللہ کے مخصوص اور متقی بندون کی حالت جداگانہ ہی ورنہ عام حالت یہی ہی ؎

گہ اندر نعمتی مغرور غافل + گہ اندر تنگدستی خستہ وریش۔

قال عز اسمہٗ یوم تبدل الارض غیر الارض والسموات وبرزو للہ الواحد القہار ۃ (سورہ ابراہیم) یعنی قیامت کے دن آسمان اور زمین مین تبدیلی واقع ہوگی اب اس تبدیلی مین دو احتمال ہین ایک یہ کہ ذات باقی ہو لیکن صفت بدل جاوے اور دوسرے یہ کہ ذات اور صفت دونون بدل جائے اور مفسرین کا دونون جانب رجحان ہی۔

قال عز اسمہٗ وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیہم فاسئلوا اہل الذکر ان کنتم لا تعلمون ۃ بالبینات والزبر ۃ (سورہ نحل) اس آیت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ عورتون مین کبھی کسی کو عہدۂ رسالت یا نبوت نہین ملا ہی۔

قال غرائبہ واوحی ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتا الخ (سورہ نحل) وحی کے معنی حقیقی تو یہ ہی کہ اللہ پاک بواسطہ جبرئیل علیہ السلام کے یا کبھی بلا واسطہ روح القدس کے انبیاء علیہم السلام کو تعلیم دے لیکن بطور معنی مجازی کے عام لوگون کے لئے بلکہ غیر انسان کے واسطے بھی بولا جاتا ہی جیسے واوحینا الی ام موسیٰ ؛ یا واوحی ربک الی النحل یعنی خدا نے اس مکھی کے دل مین یہ بات ڈالدی کہ بغیر مدد پرکار کے مسدس شکل کا حیرت انگیز مکان بنالیتی ہی اور درختون کے پھولون کا جوہر حاصل کرکے لذیذ اور پائدار اور نافع مٹھائی تیار کرتی ہے۔

قال غرائبہ۔ من عمل صالحا من ذکر او انثی وھو مومن فلنحیینہ حیوٰۃ طیبۃ ط (سورہ نحل) ترجمہ جس مومن مرد یا مومنہ عورت نے عمل نیک کیا ہی پس ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کرین گے اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ ایمان اور عمل صالح دونون علیحدہ علیحدہ دو چیز ہے کیونکہ عمل صالح کے قبول ہونے کی واسطے شرط ایمان ہی اور شرط و مشروط میں مغائرت ہوا کرتی ہی ہر کیف اس سے یہ پتہ ملا کہ مومن کی نیکی قبول ہوتی ہی اور اگر ایمان نہین ہے تو اعمال صالحہ کا کوئی ثمرہ آخرت مین نہین ملیگا اور آیت فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ کا ہر شخص کے عمل صالح پر اجر کی مثبت ہے بظاہر ان دونون آیتون مین اختلاف اور تضاد معلوم ہوتا ہی لیکن درحقیقت ان دونون مین اختلاف اور تضاد نہین ہی کیونکہ آیت زیر بحث مین اس قسم کے اجر کا تذکرہ ہی کہ جسکا نام حیات طیبہ ہے یا نجات ابدی پس ایسا بدلا بیشک مخصوص ہی مومنون کے واسطے اور اس کے علاوہ دوسرے قسم کا اجر مومنون سے مخصوص نہیں ہی بلکہ جو آدمی بھلائی کریگا اس کو کچھ نہ کچھ بدلا پالیگا مثلاً دنیاوی ترقی یا تخفیف عذاب وغیرہ (ع)

سخن سناس نائی دلبرا خطا اینجاست ۔

قال عز اسمہٗ ۔ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہٗ (سورہ اسراء)

یہ آیت حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج سے متعلق ہے اکثر مسلمان تو معراج جسمانی کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ حضور شب معراج میں بجسدہ آسمان پر تشریف لیگئے اور تھوڑے آدمی معراج روحانی کے، اور کفار دونوں کے منکر ہیں۔ اب غیر مسلموں سے تو ہم کو بحث نہیں ہے جس کی وجہ آگے مذکور ہو گی ہاں قائلین معراج جسمانی کے بعض دلیلوں کو ہم تفسیر کبیر وغیرہ سے بطور خلاصہ کے ناظرین کی وسعت معلومات کیلئے اس جگہ لاتے ہیں۔

اول یہ کہ اس قدر تیز اور سریع حرکت فی نفسہٖ ممکن الوقوع ضرور ہے اور اللہ ہر ممکنات پر قادر ہے دیکھو بلقیس کا تخت چشم زدن میں یمن سے شام میں آنا تو نص قرآن سے ثابت ہے۔ دوسرے یہ کہ شعاع بصری کی بیحد تیز رفتاری تو روزمرہ کا میرا مشاہدہ ہے بس جبکہ سرعت حرکت ہر طرح سے ممکن الوقوع بلکہ واقع بھی ہے تو معراج شریف کے معاملہ میں یہ کہنا کہ اتنی دور دراز مسافت اتنے قلیل عرصہ میں کیونکر قطع ہو سکتی ہے یہ دعویٰ بلا دلیل اور یہ عذر بالکل ناقابل التفات اہل خرد ہے اب اگر کوئی یہ کہے کہ حرکت سریعہ کا ممکن الوقوع ہونا تو ہم نے بھی تسلیم کر لیا۔ لیکن جسم عنصری کا آسمان پر جانا بعید از عقل وخلاف فطرت ہے جواب اس کا یہ ہے کہ حضور پر نور کے جسم اطہر کو دوسرے انسانی اجسام کی طرح کثیف سمجھنا نہایت غلطی ہے بلکہ جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مقدس لطیف اور الطف ہے دیکھو جس طرح لطیف اور نورانی چیزوں کا سایہ نہیں ہوتا ہے اسی طرح سرکار کے بھی جسم اطہر کا سایہ نہیں تھا اور اس لئے

بل دانش حضور کو سراپا نور اور لطیف کہتے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر بفرض محال سرکار کے جسم کو بھی مثل اور اجسام بشری کے کہا جاوے پس جس طرح سے حسب قول فلسفی کہ جسم کثیف اور عنصری کا اوپر جانا خلاف تقاضاء فطرت ہے اسی طرح جسم لطیف اور نورانی کا اوپر سے نیچے کو آنا بھی خلاف فطرت۔ اب اگر فلسفہ کی تقلید کرکے ان دونوں اعتقاد عقلی کو صحیح مانا جاوے تو سب سے بڑی خرابی یہ لازم آویگی کہ ایک معراج جسمانی کے انکار سے تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کا انکار اور ان کی تکذیب لازم آتی ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ چونکہ جبرئیل علیہ السلام کا جسم نورانی اور لطیف ہے لہذا وہ عالم بالا سے دنیا میں خلاف تقاضاء فطرت کے نہیں آسکتے ہیں اور جب روح الامین زمین پر نہیں آئے تو انبیا کو وحی کس نے لاکر دی اور جب جبرئیل کا آنا محال ہوا تو کوئی آسمانی دین بھی نہیں کہلا سکتا ہے اور جملہ انبیاء علیہم السلام نے یہی دعویٰ کیا ہے کہ ہم کو جبرئیل علیہ السلام نے وحی لاکر دیا ہے اب بتلائیے کس کس کی تکذیب ہوتی ہے اور دروازہ نبوت کیسا مسدود ہو جاتا ہے کیونکہ جمیع مسلمانوں کا بلکہ جمیع اہل ادیان آسمانی کا یہی عقیدہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام اپنے جسم نورانی اور لطیف کے ساتھ زمین پر نازل ہو کر نبیوں کے پاس وحی لایا کرتے تھے اب اس قدر لوگوں کی تکذیب اور اتنی خرابی کیوں لازم آتی ہے وہ صرف معراج جسمانی کے انکار سے یہ تو وہی مثل ہو گئی کہ خر من المطر وقر تحت المیزاب اب اس لئے ہر مسلمان کو معراج جسمانی کے امکان کا خواہ مخواہ قائل ہونا ہی پڑتا ہے انتہی ملخصاً من تفسیر الکبیر اب پھر دوسرا سوال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ آسمان کا خرق والتیام کیونکر ہوا اس کے متعلق اس قدر عرض کرتا ہوں کہ قدرت خدا کسی اصول اور فلسفہ کی پابند نہیں ہے البتہ عادت الٰہیہ یہ ہے کہ روزمرہ جو کام ہوا کرتا ہے اس کی وجہ عقلاً اور اصحاب فلسفہ کے سمجھ میں آیا کرتی ہے اور جو کام کہ محض اظہار قدرت کاملہ کے لئے کیا جاتا ہے وہ سب اسی قسم کا ہوتا ہے

کہ جس کی وجہ ہماری سمجھ سے باہر ہو اس لئے انبیاء علیہم السلام کے جتنے معجزات
ہین اس کی یہی حالت ہی لہذا بعد وقوع معجزات کے خوش قسمت عقلا کو اپنی نقصان
عقلی کا اعتراف کرنا پڑتا ہی اور اللہ کی قدرت کو جان کر نبی اور رسول کی تصدیق
کرتے ہین اور کمبخت وہٹ وہر مون کی ہٹ وہرمی بڑھ جاتی ہی دیکھو قران مجید
مین صریح مذکور ہی۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے دریا پھٹ گیا اور حضرت
موسیٰ علیہ السلام معہ اپنی جماعت کے اس مین سے بخوف وخطر پار اتر گئے حالانکہ
اس طرح سے خلاف فطرت کے دریا کا خرق والتیام پھر آجتک وقوع مین نہین
آیا کہ اس مین بلا دیوار وغیرہ قائم کئے ہوئے سڑک بن جاوے اور پانی کا طبعی
میلان بلاکسی قاسر ظاہری کے ایک وقت معین تک ملتوی رہا ہو مگر قران
اس کو بتلاتا ہی کہ حضرت موسیٰ کیواسطے یہ سب کچھ وقوع مین آیا ہی اور یہ
بیخوف وخطر اس سے بغیر مدد کشتی وجہاز کے اس طرح سے پار ہو گئے تھے
جیسے کہ خشکی پر چلا کرتے ہین

کماقال تعالیٰ۔ ان اسر بعبادی فاضرب لھم طریقا فی البحر یبسا لا
تخاف درکا ولا تخشی پس بہت ممکن ہی کہ اسی طرح سے آسمان کا خرق
بھی معراج کیواسطے ہوا ہو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کیواسطے دریا مین
راستہ بن گیا تو سردار دوجہان کی تشریف بری کے لئے آسمان مین رستہ
اور دروازہ ہونا محال کیا ہے۔ اور اس زمانہ مین جبکہ برقی قوت سے مختلف
کام نکل رہا ہی اور ہوائی جہاز کے ذریعہ سے ہزارون من بوجھ حیز طبعی کی
خلاف اوپر جاتا روزمرہ مشاہدہ ہورہا ہی۔ تو پھر براق پر سوار ہو کر سرکار
کا اوپر تشریف لیجانا کون سا مقام تعجب ہی کیونکہ براق کا تو نام ہی یہ بتلاتا
ہی کہ وہ سراپا برقی کوئی چیز ہے رہا غیر مسلمون کا انکار اس کے جواب

مین ہم کو کچھ بھی ضرورت لکھنے کی نہین ہی کیونکہ اس کا جواب خود قرآن نے دیدیا ہی کہ وما جعلنا الرؤیا التی ارینٰک الا فتنۃ للناس ط یعنی واقعہ معراج کو تیرے ای نبی ہم نے لوگون کے واسطے امتحان قرار دیا ہی تاکہ مومنین کے ایمان بالغیب کے قوت وضعف کا حال معلوم ہوجائے اور منکرین کا استحقاق عذاب تکمیل ہوجائے۔ الغرض کیسی قوی دلیل سے اسکا وقوع ثابت کردیا جائے مگر کور باطنون کو یہ ثبوت مفید نہیں ہو سکتا ہی کیونکہ جملہ ثمرات تو ایمان بالغیب پر موقوف ہیں اور ایمان بالغیب ہی کی جانچ کے لئے یہ واقعہ معراج رات کو وقوع میں آیا۔ کیونکہ اگر دن کو ہوتا تب معراج پر ایمان بالغیب نہین ہوتا بلکہ وہ تو ایمان بالمشاہدہ ہوجاتا چنانچہ اس واقعہ کی تصدیق سب سے اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کی ہی جس کا ثمرہ ان کو یہ ملا کہ وہ صدیق کہلائے اور قیامت تک انشاء اللہ ان کی یاد صدیق کے ساتھ رہنے والی ہی اور معراج شریف کے ماننے والون کو معجزہ شق القمر کی تصدیق مین بھی کوئی شک وشبہ نہین رہتا ہی کیونکہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اعجازاً دریا کو پھاڑ دیا تو سرکار دوجہان نے اگر چاند کو دو ٹکرہ کیا تو اس میں دشواری کیا ہی اور معجزہ شق القمر میں وہ اعجاز ہی جو بصورت معجزہ شق الشمس کے حاصل نہیں ہوتا الغرض حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارضی اور سماوی دونون قسم کی معجزے ظاہر ہوئے اور یہ اس رحمۃ للعالمین کی ذات پاک کی برکت تھی کہ معجزہ شق القمر کے منکرون پر دنیا میں فی الفور عذاب نہیں آیا ورنہ اس انکار کا تو تقاضا یہ تھا کہ منکرین بہت جلد سخت عذاب میں مبتلا کردے جاتے جیسا کہ آسمانی معجزہ کے منکرون کے لیئے فمن یکفر بعد منکم فانی اعذبہ عذابا لا اعذبہ احدا من العٰلمین۔ سے سمجھا جاتا ہے۔ اللہم انی اشہد ان لا الٰہ

الا انت ومحمد نبیک ورسولک خاتم النبیین واشہد ان لا نبی بعدہ اللہم توفنی بالخیر وتوفنی مسلما والحقنی بالصالحین۔

قال عز اسمہ۔ عسیٰ ان یبعثک ربک مقاماً محمودا۔ (سورۂ اسرا) بالضرور تیرا رب تجھکو مقام محمود عطا کرے گا۔ مقام محمود باتفاق مفسرین مقام شفاعت ہے لفظ عسیٰ جس وقت خدا کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے تو بمعنی وجوب آتا ہے اور دوسروں کے ساتھ بمعنی امید۔

قال عز اسمہ۔ یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی (سورۂ اسرا) اے نبی لوگ آپ سے روح کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ فرمادیں کہ روح خدا کا ایک حکم ہے سائل کی غرض سوال سے یہ تھی کہ روح قدیم ہے یا حادث جواب میں من امر ربی کہا گیا جس سے معلوم ہوا کہ روح قدیم نہیں ہے۔ بلکہ خدا کی تخلیق اور تکوین سے اسکا وجود ہوا ہے چونکہ یہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے اس لئے اس اردو کے رسالہ میں قدما محققین مثلاً امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ و امام فخرالدین رازی وغیرہم کے تحقیقات کا خلاصہ میں بھی ناظرین کی وسعت معلومات کی غرض سے بیان درج کرتا ہوں امید ہے کہ اہل فہم کو مضمون ذیل پر نظر غائر ڈالنے سے روح کے متعلق ایک حد تک تشفی بخش انکشاف حاصل ہوگا قبل اس کے کہ اصل بحث شروع کیجائے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ روح کے مسئلہ میں کسی قسم کی بحث کرنا نہیں چاہیئے اور اس میں گفتگو کرنا ناجائز ہے اور اکثر علمار راسخین کی رائے یہ ہے کہ مثل اور مسائل کے روح کے متعلق بھی بحث و گفتگو ہوسکتی ہے مگر چونکہ انسان کا علم باعتبار علم خداوندی کے محض قلیل ہے لہذا روح کا ادراک تام انسان کو البتہ دشوار ہے مگر بحث و گفتگو سے ایک قسم کا ادراک ہوجاتا ہے جو کہ اس تحقیقات کے قبل والے علم سے درجۂ تفصیل کا حکم رکھتا ہے یعنی پہلے بہت مجمل تھا اب فی الجملہ

اسکے نزدیک مفصل ہو جاتا ہی اس مسئلہ پر پہلی بحث یہ ہی کہ روح اور انسان دونون
ایک ہی چیز ہی یا کہ علحدہ علحدہ دو چیز ہی۔ اتنی بات تو سب کو معلوم ہی کہ کوئی چیز
ضرور ہی کہ جس کو انا۔ یا مین۔ یا ہم۔ یا تو۔ یا وہ وغیرہ سے تعبیر کیا جاتا ہی۔ مثلاً زید نے
جس وقت یہ کہا کہ مین اس کام کو کرتا ہون تو اب اس لفظ مین سے مراد یہ جسم ہی یا کوئی
شے اس جسم سے غیر اس کا مصداق ہی۔ یا جسم اور وہ غیر دونون مل کر مراد ہی۔ پس
یہی تین صورتین ذہن مین آتی ہین اب مین اس جسم محسوس کو مصداق انا یا انسان نہین
کہہ سکتا ہون کیونکہ اس جسم محسوس کا انسان ہونا چند عقلی اور نقلی دلیلون سے
باطل ہی۔ عقلی دلیل پہلی یہ ہی کہ ہر انسان اس بات کو بخوبی جانتا ہی کہ اجزاء
اس جسم محسوس کے متغیر ہوا کرتے ہین یعنی بدن کبھی چھوٹا رہتا ہی تو پھر کبھی
بڑا ہو جاتا ہے کبھی دبلا کسی وقت موٹا جاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ بدلنے والی
چیز ثابت رہنے والی شے سے متاثر ہوا کرتی ہی عین نہین ہوتی۔ لیکن یہ سب
جانتے ہین کہ انسان ابتداء عمر سے اپنے کو انسان سمجھتا ہی جسم کی فربہی یا لاغری
سے نفس انسانیت کے اطلاق مین کوئی کمی یا زیادتی نہین ہوا کرتی ہی۔ زید
جیسے لڑکپن مین زید تھا اسی طرح جوانی مین زید ہی ویسا ہی بڑھاپے اور صحت و
مرض کی حالت مین۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ انسان اس جسم کا نام نہین ہے
کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو باعتبار ان تغیرات کے اطلاق انسانیت مین بھی اختلاف
ہوا کرتا۔ دوسری دلیل یہ ہی کہ انسان یہ کہتا ہی کہ میرا سر میری آنکھ میرا ہاتھ
میرا پیر۔ اور ترکیب اضافی مین مضاف مضاف الیہ کا غیر ہوا کرتا ہی جیسے زید
کا گھوڑا تو زید جو مضاف الیہ ہی یہ دوسری چیز ہے اور گھوڑا جو مضاف الیہ ہی
یہ الگ ایک چیز ہے یہ نہیں ہی کہ زید اور گھوڑا دونون ایک ہی چیز ہی۔ پس بربناء
ترکیب اضافی کے بھی یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ اعضاء انسان کے ہین لیکن خود

یہ اعضا انسان نہیں ہین - ورنہ بصورت عینیت کے اضافت نہین ہوتی ہان اس بدن محسوسہ کو کبھی مجازاً بمعنی نفس یا ذات بھی استعمال کر کے نفسی یا ذاتی بولا کرتے ہین مگر آجتک کسی انسان نے لفظ انا بی کا تلفظ یا استعمال انہو واسطے نہین کیا ہو یعنی یہی عینیت اس امر کی مانع ہو کہ انسان کی اضافت ی متکلم کے طرف کی جائے کیونکہ صحت ترکیب اضافی کا تقاضا غیریت فیمابین مضاف و مضاف الیہ ہو۔

تیسری دلیل یہ ہو کہ اللہ تعالے نے فرمایا ہو کہ ولا تحسبن الذین قتلو فی سبیل اللہ امواتا۔ بل احیاءٌ اس آیت سے اس امر کی تشریح پائی گئی ہو کہ شہداء زندہ ہین اور حالانکہ ان کے جسمون کو وہ دیکھا جاتا ہو۔ بس یہ معلوم ہوا کہ انسان کا بدن جس وقت مردہ ہو جاتا ہو اس وقت بھی وہ انسان زندہ رہتا ہے گرچہ یہ عموم ہر انسان کے واسطے ہو۔ مگر شہداء کے حیات کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا گیا کہ یہ حضرات اپنی اس زندگی سے بھی نہایت آزادی کے ساتھ نفع حاصل کر رہے ہین اور دوسرے اموات یا تو کفار و مشرکین و فساق ہین جو کہ طرح طرح کے عذاب مین مبتلا ہین لہذا یہ دکھ درد والی زندگی کا وجود و عدم برابر ہو یا عامۂ مومنین ہین کہ جن کو گرچہ اس وقت اس برزخی زندگی میں کوئی تکلیف نہیں ہے بلکہ ان کی یہ برزخی زندگی ایک گونہ خواب کی حالت سے مشابہ ہو جیسا کہ حدیث میں ہو کہ نم کنوم العروس اور ان کے حصول راحت کاملہ اور لذات تامہ کے لئے قیامت کا دن مقرر کر دیا گیا ہو۔ بہر کیف کچھ بھی وجہ تخصیص ذکر شہداء کی ہو اس آیت سے بھی یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہو کہ انسان اس بدن محسوس کے علاوہ دوسری چیز ہے چوتھی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں فرعونیون کے متعلق یہ مذکور ہے کہ مما خطیاتھم اغرقو فادخلو نارا فلم یجدو لھم من دون اللہ انصارا۔ یعنی آل فرعون دریا میں ڈوبنے کے ساتھ ہی آگ میں داخل کر دیئے گئے کیونکہ

فادخلوا میں فاء تعقیبیہ ہے۔ جو تراخی کا منافی ہے(۴) گرو ہے بآتش بردزاب نیل
اور حالانکہ اجسام ان کے دریائی نیل مین مارے مارے پھرتے تھے بلکہ خاص فرعون
لعین کی نعش تو سنتا ہون کہ شاید ابتک دنیا مین مصر کے عجائب خانہ میں موجود ہے
پس اگر انسان اس جسم کا نام ہوتا تو پھر آگ مین کون گیا یا اگر انسان جسم اور روح
دونون کے مجموعہ کا نام ہوتا تب بھی فی الفور اس پر کیسے عذاب ہو سکتا تھا کیونکہ ایک
جزو تو اسکا عالم محسوس مین ابتک موجود ہے حاصل کلام یہ ہے کہ انسان نہ تو یہ جسم ہے
اور نہ جسم اور روح کے مجموعہ کا نام ہے بلکہ انسان وہ چیز ہے جسکا دوسرا نام روح ہے
اور وہی مرتکب افعال ہے اور وہی مستحق جزا و سزا اور اسی جگہ سے یہ بات بھی معلوم
ہوگئی کہ جزا و سزا کے لیئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ روح کو کسی قالب کے اندر مقید
کر کے جزا و سزا دی جائے کیونکہ فرعونیون کے متعلق قران مجید مین مذکور ہے کہ۔
فالیوم ننجیک ببدنک لتکون لمن خلفک ایۃ الخ یعنی فی الحال فرعون
کے جسم کو نجات دیگئی ہے تاکہ آئندہ نسل والون کو عبرت ہو کہ دنیا مین ایسی جبروتی
سلطنت رکھنے والا انسان کس بیکسی کے ساتھ مارا گیا۔ مگر فرعون کا اس وقت معذب
ہونا بہت آیتون اور حدیثون سے ثابت ہے جس سے یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہر مجرم
روح کو نفس سزا دینے کے واسطے قالب کی ضرورت دائمی نہیں ہے جیسے فرعون کا جسم
عجائبخانہ میں ہے مگر اس پر عذاب ہو رہا ہے اسی طرح سے حصول لذات کے لیے ہمیشہ
قالب کی احتیاج نہیں ہے۔ جیسے شہداء کے اجسام اُن کے باوجودیکہ عالم محسوس
میں موجود ہوتے ہین مگر پھر بھی اس کے حصول راحت و عذر کی خبر قران میں موجود
ہے کہ عند ربہم یرزقون۔ یعنی خدا کے نزدیک وہ رزق کھاتے ہین ہان بعض
راحت یا بعض تکلیف ایسی ہے کہ اس کا احساس اور ادراک روح کو اس وقت ہوتا ہے
جس وقت کہ اس کا تعلق اجسام کے ساتھ ہو جاوے جیسے اس حیات عرفی اور زندگی

حِسّی کی راحت یا تکلیف کے ہمیشہ ان اجسام و اعضار کے واسطہ سے محسوس ہوتی ہی
بیشک اس قسم کی جزا یا سزا بعد قیام قیامت کے دار آخرت میں واقع ہوگی جبکہ
ہر انسان کا اپنے اپنے اجسام سابقہ کے ساتھ دوبارہ تعلق ہو جائیگا۔ مگر چونکہ خدا کی
قدرت غیر محدود ہی لہذا اس وقت بھی وہ جس مجرم انسان کو سزا دینا چاہتا ہی دیتا ہے
اور جس فرمان بردار آدمی کو آرام پہونچانا چاہتا ہی تو اس کے مرنے کے بعد ہی آرام پہونچاتا
ہی جس کی کیفیت کا علم ہم کو حاصل نہین اور نہ ضروری ہی کہ ہم اس کیفیت کو بھی جانین
بلکہ جب قرآن نے شہداء کے متعلق عِندَ رَبِّہِم یُرزَقُون کہکر راحت کی خبر دیدی ہی یا
فرعون نمرود وغیرہ کفارون کے موجودہ سزا کو بتایا ہی تو ایک مسلمان کو یہی زیبا ہی کہ بلا چون
وچرا کے اس پر ایمان رکھے۔ سے امور مملکت خویش خسروان دانند۔ گدائے گوشہ نشینی
تو حافظا مخروش۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ عذاب و ثواب دینے کے واسطے قالب تو
ضرور درکار ہی۔ مگر یہی قالب نہین بلکہ ممکن ہی کہ کسی دوسرے قالب مین رکھکر سزا یا جزا
دی جاتی ہو جواب اسکا یہ ہی کہ یہ تو مشرکون کا عقیدہ ہی کیونکہ کفار اس قالب کے اعادہ
کے منکر تھے قَالَ مَن یُحیِ العِظَامَ وَھِیَ رَمِیم۔ اور اسی بنا پر عذاب آخرت کا بھی
انکار کرتے تھے جس کو قرآن مجید نے سختی سے باطل کیا ہی اور اسی جسم کے اعادہ کا
جا بجا دعویٰ کیا۔ کما قال۔ قُل یُحیِیھَا الَّذِی اَنشَاَھَا اَوَّلَ مَرَّۃٍ وَھُوَ بِکُلِّ خَلقٍ
عَلِیم ط لہذا مسلم ایسے شبہ کو اپنے دل مین جگہ نہ دے اور کیا خدا انسان کو کسی وقت
بغیر قالب سزا و جزا دینے کی قدرت نہیں رکھتا ہی جو ہم ایک دوسرا قالب تسلیم کرین وہ
ہر طرح سے قادر ہی لیکن بات یہ ہی کہ عادت الٰہی یہی ہی کہ اصلی اور کامل جزا و سزا کے لئے
قیامت کے دن ان دنیاوی اجسام کو لوٹا کر روح کو اس سے پھر وابستہ کریگا اب
اگر کوئی اِنَّ الَّذِینَ کَفَرُوا بِاٰیٰتِنَا سَوفَ نُصلِیھِم نَارًا کُلَّمَا نَضِجَت جُلُودُھُم بَدَّلنٰھُم
جُلُودًا غَیرَھَا۔ لِیَذُوقُوا العَذَابَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَزِیزًا حَکِیمًا ط کو پیش

کرکے یہ دعویٰ کرے کہ اس آیت سے تو قالب کا ردوبدل معلوم ہوتا ہی جس کا جواب
یہ ہی کہ جمہور مفسرین نے تبدیل سے تبدیلی صفت جلود مراد لیا ہی تبدیلی ذات جلد نہین
علاوہ اس کے جلد انسانی حقیقۃً قالب انسانی کب ہی بلکہ قالب حقیقی کے لئے یہ جلد بطور
لباس و غلاف کے ہی اسی لئے زخم وغیرہ کے وجہ سے جب اس میں کوئی نقصان آجاتا
ہی تو وہ پھر وہان پر وہ جلد علاج کے بعد موجود ہو جاتی ہی لیکن اصلی قالب جسکو کہ اطبا
اعضا منویہ کہتے ہین اس میں جب قطع و برید یا فساد کی نوبت آتی ہی تو پھر اسکا اعادہ
اس دنیا میں بھی دیکھا نہیں جاتا ہی اور اسی اصلی قالب کے اعادہ کا قران نے دعوےٰ
کیا ہی جس پر مسلمانون کا ایمان ہی کہ پھر ہمارا یہ اصلی بدن دوبارہ خدا کے حکم سے آخرت
مین لوٹایا جاییگا۔ خلاصہ یہ ہی کہ اگر انسان روح اور جسم کے مجموعہ کا نام ہوتا اور
بزعم تمہارے دوسرا قالب اس کو دیکر سزا دیتے تو چونکہ یہ قالب جدید غیر ہے قالب
مجرم سے لہذا یہ بالکل منافی عدل تھا کہ مجرم قالب کو چھوڑ دیا جاوے اور دوسرا بےجرم
قالب مستحق سزا ٹھیرے۔ بلکہ مجرم انسان نے جن آلات خاص کے ذریعہ سے لذات گناہ
اٹھائے ہین وہ خاص انہین آلات کے ذریعہ سے عذاب کی سختی بھی پائیگا اور جلد چونکہ
از قسم لباس ہی لہذا اگر اس کی تبدیلی مرۃ بعد اخریٰ مان بھی لی جائے تو اس سے نہ تو
قران کی کسی آیت متعلقہ عذاب و ثواب کو تعارض ہوتا ہے اور نہ کسی طرح یہ مستلزم ثبوت
تناسخ ہے۔ پانچوین دلیل یہ ہی کہ انسان کبھی اپنے مرے ہوئے باپ یا دوست
کو خواب مین دیکھتا ہی کہ وہ مردہ کسی دفینہ کی جگہ بتلاتا ہی یا کسی امر کی خبر دیتا ہے
اور بعد جاگنے کے ٹھیک بتانے اس مردہ کے اس کو پاتا ہی اب اگر انسان جسم و روح
کے مرکب کا نام ہوتا تو یہ خبر دہندہ کون ہی کیونکہ جسم تو اس کا بٹر گل چکا ہی۔
چھٹی دلیل یہ ہی کہ اگر کسی کا ہاتھ پیر یا ناک کان کاٹ ڈالا جائے تو اسکے انسانیت
مین کوئی فرق نہین آتا ہی بلکہ وہ اسی طرح سے آدمی کہلاتا ہی جیسا کہ قبل اس جسمانی

نقصان ہے کے کہلاتا تھا۔ اور اگر شے مرکب کا نام انسان ہوتا تو بعد اس نقصان جسمانی
کے اس کو انسان نہین کہتے کیونکہ انتفاء جزء مستلزم ہے انتفاء کل کو جیسے سکنجبین کے
سرکہ اور شہد کے مجموعہ کا نام ہے اور اگر اس کے اجزاء کو علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے تو
سکنجبین کوئی نہین کہلاویگا بلکہ ایک کا نام سرکہ ہوتا ہے اور دوسرا شہد کہلاویگا
ساتوین دلیل ۔ یہ ہے کہ قرآن و حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ایام سابقہ مین
بعض گنہگارون کو خدا نے مسخ کر کے بندر بنا دیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ بحالت مسخ وہ انسان
ہے یا نہین اگر کہو کہ نہین تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ انسان مر گیا اور اس کے عوض مین
ایک بندر پیدا کیا گیا پس اسکا نام مسخ نہین ہوا حالانکہ شریعت نے اس کو مسخ کہا ہے
اب لامحالہ یہی کہنا ہوگا کہ بحالت مسخ بھی وہی انسان ہے پس صریحاً ثابت ہوا کہ انسان
جسم اور روح کے مجموعہ کا نام نہین ہے **آٹھوین دلیل** یہ ہے کہ زانی کو پشت پر کوڑا
مارا جاتا ہے حالانکہ زنا کا صدور پیٹھ سے نہین ہوا تھا جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ انسان
نہ تو اس جسم کو کہتے ہین اور نہ روح اور جسم کے مجموعہ کو کہتے ہین اب آخر وہ
انسان ہے کون شی یا وہ روح ہے کون چیز اس مین عقلاء کا اختلاف ہے بعضون کی
رائے ہے کہ خلاصہ خون سے ایک جوہر لطیف پیدا ہوتا ہے اسی کا نام روح ہے یہ مذہب
اطباء کا ہے لیکن اس مین شبہہ یہ وارد ہوتا ہے کہ اخلاط کی تولید غذا سے ہے اور غذا
کی ضرورت بعد نفخ روح کے پیش آتی ہے اور غذا مین تصرف بھی روح کا فعل ہے پس
اس جوہر کو جو کہ غذا سے حاصل ہو حقیقی روح کہنا مستلزم ہے ایک دو محال کا تقدم
شی علی نفسہ کا اور دوسرا دور کا ہان اطباء نے اپنی اصطلاح مین جسکو روح کہا
ہے اور حیوانی و نفسانی اور طبعی اس کی قسمین بتائی ہین یہ طبی روح بھی اس حقیقی روح کے لئے
ایک فرمان بردار اور نہایت مطیع خادم ہے بہرحال یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ روح کا
ادراک بوجہ مانع غیر ممکن ہے کیونکہ جب اللہ پاک کی فی الجملہ معرفت انسان

کے لئے ممکن ہی تو روح کی کیا حقیقت ہو البتہ معرفت الٰہی پر احاطہ کرنا یہ بیشک
طاقت بشری سے باہر ہو کیونکہ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ما
عرفناک حق معرفتک پس دوسرون کا کیا شمار ہو لہذا روح کا ادراک بوجہ
ماہیت محال ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی ہو لیکن کسی ایک قول پر البتہ سارے عقلا
کا متعلق روح کے اتفاق نہین ہی۔ اطبار کا مذہب تو ہم نے اوپر نقل کیا اب بعض
گروہ عاقلون کا ایک قول یہ ہو کہ روح ایک جسم کی لطیف الجوہر ہے مثل ضیار آفتاب
کے جو کہ تفریق اور تقطیع کو قبول نہین کرتی ہو اور جبکہ بدن کی تکوین ہو جاتی ہو اور
قالب مین اس کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہو اس وقت اس جسم نورانی
کا نفوذ اس قالب مین بحکم خدا اس طرح سے ہو جاتا ہو جیسے کوئلہ مین آگ یا تل مین تیل
جس کا ثبوت اس آیت سے بھی ملتا ہو کہ فاذا سویتہٗ ونفخت فیہ من روحی یعنی
جبکہ اس کا مکان تیار ہو گیا۔ پس اس مکین کو ہم نے اس مکان مین داخل کر دیا اور
وہ اس وقت سے برابر (جب تک کہ جسم صحیح و تندرست رہتا ہو اور اس مین اس مکین کی قیام
کی صلاحیت رہتی ہو) حکمران رہتا ہے اور جب بدن میں اخلاط فاسدہ کی وجہ سے یا اور کسی
سبب سے کوئی خرابی آجاتی ہے اس وقت وہ مکین اس قالب سے باہر نکل جاتا ہو جس کا
نام موت ہی۔ امام غزالی کی رائے یہ ہو کہ الانسان موجود لیس بجسم ولا جسمانیتہ۔ واضح
ہو کہ یہ بات مشہور ہی کہ انسان عالم صغیر ہو اور دنیا عالم کبیر۔ یعنی جتنی چیزین دنیا مین
ہین ان سب کا نمونہ جسم انسان مین موجود ہو اور جس طرح سارے جہان کا حقیقی مدبر
اللہ پاک ہی اور یہ شمس و قمر ابر و باد وغیرہ وغیرہ مظاہر قدرت الٰہی ہین اور اللہ
نظام دنیا۔ اور یہ آلات اسی وحدہٗ لاشریک لہٗ کے حکم سے اپنا اپنا کام بجا لاتے ہین اور
نافرمانی نہیں کرتے ہیں اسیطرح سے روح بھی اس عالم صغیر کیلئے مجازی مدبر ہو اور یہ ہاتھ پیر وغیرہ اعضاء
اسی مدبر کے حکم و اشارہ سے ان کامون کو بجا لاتے ہین اور جیسے عالم کبیر کے مدبر کو

کوئی دیکھ نہین سکتا ہی لیکن اس کے وجود سے انکار بھی کوئی کر نہین سکتا ہی اسی طرح سے
اس عالم صغیر کے مدبر مجازی یعنی روح کو بھی کوئی دیکھ نہین سکتا ہی لیکن روح کے وجود کا
اقرار بھی سب کو کرنا پڑتا ہی، اور ہر شخص روح کے وجود کا معتقد ہی ہان یہ دوسری بات ہی
کہ ماہیت اس کی کماحقہ تفصیل کے ساتھ اور منفقہ طور پر تقریر یا تحریر مین ضبط نہین ہو سکتی
ہی۔ حاصل کلام یہ ہی کہ اس مضمون سے روح کی قدامت کا بطلان ظاہر ہو گیا کیونکہ روح
جب حادث اور مخلوق خدا ہی اور جو شئی حادث ہوتی ہی وہ ازلی ہرگز نہین ہوتی ہی۔
اصحاب مکاشفہ اور عارفین کی رائی روح کے متعلق یہ ہی کہ روح ایک نورانی
جوہر مجرد ہی اور وہ اجسام کے جنس سے نہین ہی جس کا دار السلطنت تو قلب ہی مگر
ضیا اس کی جسم کے ہر ایک جزو مین موجود ہی۔ یہی وجہ ہی کہ قلب کسی قسم کے زخم کا
متحمل نہیں ہی۔ یعنی جس آن میں کوئی سخت صدمہ قلب کو پہونچتا ہی یا قلب مین جراحت
کا سامان پیدا ہوتا ہی فوراً جان نکل جاتی ہی۔ قلب اور روح اور جسم کے تعلقات کی
مثال اس طرح سے سمجھو کہ کسی کمرہ مین ایک طاق ہو اور اس طاق میں چراغ ہو تو گرچہ
مستقل و بالذات تو وہ چراغ طاق میں ہی لیکن نور اس کا پورے کمرہ کو منور کر رہا ہے
بہر کیف اگر روح مشابہ اجسام کے ہوتی اور اس کے ذات میں تغیرات واقع ہوا کرتے
تو یقیناً جواب مین ان تغیرات تدریجی کا تذکرہ کیا جاتا۔ صرف قل الروح من امر ربی پر اکتفا
نہین کیا جاتا۔ پس روح خدا کی ایک مخلوق ہی جو بوجہ غایت لطافت کے ہم کو نظر نہین
آتی ہی۔ جیسے ہوا کہ وہ بھی مخلوق اور حادث ہی مگر بوجہ اس کی لطافت کے ہم ہوا کو بھی
نہین دیکھتے ہین مگر اس کے آثار سے اس کے وجود کا یقین کرتے ہین اب ان تحقیقات
معروضہ پر مخالفین کے جو عقلی اور نقلی اعتراضات ہین ان کو بھی معہ جواب کے اسی مقام
پر نقل کر دیتا ہون۔ پہلا اعتراض تو عقلی یہ ہی کہ لو فرضنا کہ روح نہ جسم ہی نہ
عرض تب تو اس کو مساوات ہو گیا خدا کی ماہیت میں جو کہ مستلزم شرک ہی جواب

اسکا یہ ہے کہ اگر بعض صفت صلبیہ مین مساوات اس کو ہو جاتی ہے تو قباحت کیا ہے کیونکہ
ایسی مساوات موجب مماثلت نہین ہوتی ہے دیکھو زید کو سینگ نہیں ہے اور گدھے کو
بھی سینگ نہیں ہے تو کیا اس ایک صلبی مشابہت کے وجہکر زید گدھا ہو جاتا ہے ہر گز
نہین - دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قران مجید میں ہے کہ . قتل الانسان ما اکفرہٗ
من ای شیئ خلقہ من نطفتہ ، خلقہٗ فقدرہٗ ثم السبیل یسرہٗ ثم
اماتہٗ فاقبرہٗ ثم اذا شاء انشرہٗ - جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسان
مخلوق من النطفہ کو کہتے ہین اور اسی پر یہ واقعات گذرتے ہین کہ مار ڈالا جاتا ہے
پھر قبر میں رکھا جاتا ہے - اور یہ معاملات ہم جسم کے ساتھ مشاہدہ کر رہے ہین لہذا
جسم ہی کو انسان کہنا چاہیئے اسکا جواب یہ ہے کہ چونکہ باعتبار عرف عام کے اسی بدن
کو انسان کہتے ہین لہذا اس آیہ میں بھی انسان اسی جسم کو بلحاظ معنی عرفی کے کہا گیا ہے
نہ بلحاظ معنی حقیقی کے - تیسرا اعتراض یہ ہے کہ قران مجید میں مذکور ہے انا خلقنا الا
نسان من نطفتہ امشاج یعنی اس میں بھی انسان اس شیئ کو کہا گیا ہے جو کہ
مخلوق من النطفہ ہے پھر جسم کو ہم انسان کیونکر نہ کہین اسکا ایک جواب تو یہی ہے کہ یہ
بھی باعتبار معنی عرفی کے ہے اور دوسرا محققانہ جواب یہ ہے کہ یہ آیت تو میرے مفید مطلب
ہے نہ کہ معترض کے وہ اس صورت سے کہ آگے چل کر مذکور ہے - نبتلیہ فجعلناہ سمیعا
بصیرا ہ جس مین ایک بات تو یہ بتلائی گئی ہے کہ انسان وہ شی ہے جو کہ مخاطب ہے اوامر
اور نواہی کا - اور جو کہ سمیع و بصیر بھی ہے - اب مجموعہ بدن کو انسان کبھی نہین کہ سکتے ہین
کیونکہ ہر ایک اعضا مین تو سمیع و بصیر حاصل نہیں ہے مثلاً کان اگر سمیع ہے تو بصیر نہین علاوہ
اس کے اگر جسم ہی سمیع و بصیر ہے تو جان نکل جانیکے بعد آنکھ کیون نہین دیکھتی ہے اور
کان کیون نہین سنتا ہے اور جسم مکلف بالشرع کیون نہیں باقی رہتا - جو چیز سمیع اور
بصیر تھی وہی مکلف بالشرع بھی تھی اور یہ سب کو معلوم ہے کہ انسان مکلف بالشرع ہے

پس یہ جسم انسان نہین ہی بلکہ روح انسان ہی۔ چوتھا اعتراض یہ ہی کہ لقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین ثم جعلناہ نطفۃ فی قرار مکین الی قولہ تعالیٰ ثم انشانٰہ خلقاً آخر سے بھی یہ معلوم ہوتا ہی کہ انسان مخلوق من النطفہ کو کہا جاتا ہی یعنی جسم کو جواب اسکا یہ ہی کہ مِن کا استعمال کلام عرب مین اصالۃً ابتداء غایت کے لئے ہی پس اس آیت مین قالب انسانی کے مراتب پیدائش کی تشریح کی گئی ہی اور اس کے جسمانی قالب میں جو جو تغیرات واقع ہوئے ہین اسی کا یہان بیان ہی یعنی خلاصہ مٹی سے ہم نے اس کو نطفہ بنایا اب مٹی سے نطفہ کیونکر بنتا ہی اس کی تفصیل یہ ہی کہ نطفہ کا وجود والدین کی غذا سے ہوتا ہی اب غذا یا تو نباتی ہی یا حیوانی اگر نباتی ہی تو ان نباتات کی نشو و نما زمین کے اندر ہوتی ہی اور زمین کے جوہر لطیف (یعنی سلالۃ طین) کو یہ نباتات اپنے اندر جذب کر لیتے ہین اور یہ مٹی سے پرورش پائے ہوا جز غلہ اور پھل اور حبوب کی صورتین مین کچھ عرصہ تک جلوہ نمائی کر کے خرمن و انبار و چکی و طعام و زبان اور دانت و معدہ و آنت و عروق وغیرہ ممالک کی سیر کرتا ہوا ایک عرصہ کے بعد مشکل نطفہ نہیں ہوا اور اگر غذا حیوانی ہی تب بھی اس حیوان کی غذا میں اجزاء ارضیہ کا وجود انہین چند و اسطون سے موجود ہی لہٰذا نتیجہ بہر حال واحد نکلتا ہی۔ الغرض اب یہان آکر اس کا نام منی یا نطفہ رکھا گیا۔ بقول مولانا ؎ صد ہزاران سال بودم در عطار + ہمچو ذرات ہوا بے اختیار پھر اس نے یہان سے بھی سفر کیا اور رحم میں پہونچا جہان کچھ و نون تک تو یہ علقہ کے نام سے یاد کیا گیا پھر مضغہ پکارا گیا مختصر یہ ہی کہ اسی طرح مدارج کو طے کرتے ہوئے وہ انسان کے رہنے کا ایک گھر بن گیا اور جب اس مکان میں اس کی پوری صلاحیت ہو گئی کہ مکیں اس میں سکونت کر سکے اور جب اس فرمانروا کے جملہ اسباب حکومت اسمین مہیا ہو گئے تب روح پھونک دی جاتی ہی یعنی انسان اس میں آکر بس جاتا ہی۔ ثم انشانٰہ خلقاً آخر ط اب بوجہ سکونت روح کے اس مکان مین ایسی جگمگاہٹ

اور رونق آجاتی ہو کہ اب وہ دوسری چیز میں جاتا ہو۔ غور کیجئے کہ اگر انسان صرف قالب کا نام ہوتا تو ثم انشانٰاہُ خلق آخر کہنا گویا تحصیل حاصل ہو۔ الحاصل قرآن مین جہان کہین جسم کو انسان کہا گیا ہو وہ باعتبار عرف عام کے ہو اور اسی آیت میں بھی انسان کی اعضار کے مراتب تخلیق کا تذکرہ ہو اب ایک شبھ یہ ہو کہ تمہاری تحقیق سے تو یہ معلوم ہوتا ہو کہ قالب انسان نہیں ہو لیکن خدا نے حضرت آدم کے قالب کو قبل نفخ روح کے بشر فرمایا ہو۔

کما قال تعالیٰ۔ انی خالق بشرا من طین اور یہ ظاہر ہو کہ مٹی سے تو جسم ہی تیار ہوا تھا اور اسی کو بشر اس وقت کہا گیا جس وقت کہ رُوح سے اس کو کوئی تعلق بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ جواب اس کا یہ ہو کہ مثلاً جب کوئی کالج بنایا جاتا ہو تو گرچہ وہ کالج کا مصداق تو بعد اختتام کار معمار و شروع ہو جانے کار تعلیم کے ہو لیکن مجازاً یونہی بولتے ہیں کہ کالج بنتا ہو۔ اسی طرح اس قالب آدم کو بھی قبل نفوذ روح کے مجازاً البشر کہکر سویتہ کی ضمیر کا مرجع قرار دیا گیا ورنہ حقیقتہً بشر تو وہی ہو جو نفخت فیہ من روحی سے مراد ہو اور اسی لئے جب تک بشر اس میں نہیں آیا ملائکہ نے محض قالب کو سجدۂ تعظیمی نہین کیا سب سے بڑی بات تو یہ ہو کہ اگر انسان جسم اور رُوح کے مجموعہ کا نام ہوتا تو عہد الست مین بلا کس نے کہا تھا کیونکہ جسم تو وہان نہین تھا اور اس قاعدہ سے کہ انتفار خبر مستلزم ہو انتفار کل کو انسان بھی نہیں تہا اور جب انسان نہیں تھا تو جواب میں بلیٰ انسان نے نہ کہا اور خدا نے خبر دی ہو کہ قالوا بلیٰ۔ یعنی انسان نے روز الست میں میرے ربوبیت کا اقرار کیا ہو اور اسی لئے دنیا مین جو شرک کرتا ہو اس کو یہ اقرار یاد دلا کر ملزم ٹھرایا جاتا ہو اور قرآن شریف کے اخبار کا غلط ہونا محال ہو اور بجز روح کے اور کسی چیز کو انسان کہنا مستلزم ہو تغلیط اخبار قرآنی کو اور جو چیز کے مستلزم محال ہوتی ہو وہ خود محال ہو لہذا میرا مدعا ثابت ہو کہ مجموعہ جسم اور روح کو انسان کہنا محال ہو اب اگر کوئی یہ کھے کہ وہان

بھی انسان نے قالب کے ساتھ بلا کہا تھا۔ اس کا جواب یہ ہو کہ اوّلاً تو کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا ہو کہ روز الست میں کوئی قالب بھی انسان کو تھا دوسرے یہ کہ ابھی اوپر یہ ثابت کیا جا چکا ہو کہ بغیر قالب کے بھی خدا سزا و جزا دینے کی قدرت رکھتا ہی بلکہ کبھی کبھی کسی کو انعام یا سزا بغیر قالب کے دیتا بھی ہو۔ اسی طرح سے ممکن ہو کہ اس قادر مطلق نے روز الست میں انسان سے اتنا کام بغیر وسیلہ اجسام و اعضار کے لیا ہو۔ اور تیسری بات یہ ہو کہ اگر معترض کا دعویٰ تسلیم کر لیا جائے تو اس میں تناسخ کی تسلیم لازم آتی ہو کیونکہ تناسخ اسی کو تو کہتے ہین کہ روح کسی دوسرے قالب مین دوبارہ بذریعہ سلسلہ تولید کے سما جائے اب بقول معترض عہد الست والا قالب وہین رہا اور وہ روح انسانی اسی دنیا میں اسی استخوان گوشت و پوست والے قالب میں داخل ہوئی جو میں تناسخ نہین تو اور کیا ہو اور بطلان تناسخ پر علمار اسلام نے زبردست دلائل مختلف کتابوں میں لکھے ہین لہذا مذہب حق خالی عن المفاسد یہ ہو کہ صرف روح انسان ہو۔ اور اسی کو ہر قسم کی قدرت اور اختیار حاصل ہو اور یہ اعضار اس کے خادم اور اوزار و آلات ہین جیسے کاتب تو اصل میں زید ہو لیکن قلم زید کے صفت کتابت کے اظہار کا ایک آلہ ہو۔ بس اسی طرح جملہ افعال کا صدور روح سے ہوتا ہو لیکن اسی کریم کی یہ کمال مہربانی ہو کہ جن افعال کا ارتکاب انسان نے اس عالم تکلیف مین محض اپنے مقصد اور ارادہ سے بوسیلۂ اعضار ظاہری کے کیا ہو اسی کا انسان جوابدہ قرار دیا گیا ہو اور انسان کا وہ عمل جو کہ بذریعہ ان اعضا ظاہری کے صادر اور ظاہر نہین ہوتا ہو جیسے نیت و ارادہ کہ اس کا تعلق اعضار باطنی یعنی قلب سے ہو اب اس قسم کا کام اگر برا ہو تو اس کی سزا و گرفت نہیں ہو جب تک کہ اس نیت مخفی کا ظہور نہ ہو لے مثلاً زید چوری کا ارادہ مصمم کر چکا تھا مگر اس کی نیند نہین ٹوٹی جس وجہ سے اس رات مین اس سے چوری کا صدور نہوا تو اب وہ چوری کی سزا نہین پاویگا

اور اگر وہ باطنی کام انسان کا اچھا ہو مثلاً عمر نے خوب مضبوط ارادہ کیا تھا کہ تہجد کی نماز ادا کریں گے لیکن اس کی بھی نیند نہیں ٹوٹی جس وجہ سے اس نے بھی تہجد نہیں ادا کیا مگر وہ اپنے اس نیک ارادہ پر باوجود عدم صدور فعل کے بھی کسی قدر ماجور ہے۔ سچ ہے۔

کرم حق بہانہ می جوید ۔ کرم حق بہانہ می جوید ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

قال غرائبہ۔ فنادٰھا من تحتھا الا تحزنی قد جعل ربک تحتک سریا ہ (سورہ مریم) ایک منادی نے پکار دیا کہ اے مریم تو غمگین مت ہو۔ خدا نے تیری واسطے پانی موجود کر رکھا ہے۔ قرین عقل بھی ہے کہ وہ منادی خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہوں کیونکہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش سے قبل حضرت مریم کو جبرئیل علیہ السلام نے دوبارہ مسیح کے یہ بشارت دی تھی کہ وہ لڑکا حالت مہد میں کلام کریگا لہذا پیدا ہونیکے ساتھ فوراً ہی آپ بولنے لگے ہوں تاکہ قلب والدہ ماجدہ کا اس کے مضبوط ہو جائے اور آئندہ کو جو ہو جائے تجربہ کے اپنی قوم سے دلیرانہ یہ کہہ سکیں کہ تم لوگ اسی بچہ سے پوچھو چنانچہ یہی ہوا کہ جب قوم کو حضرت مسیح کی ولادت کا حال معلوم ہوا تو وہ سب حضرت مریم سے بدگمان ہو کر کہنے لگے کہ یہ تم نے کیا کیا کیونکہ تمہارے خاندان کے لوگ تو اچھے تھے ما کان ابوک امرء سوء و ما کانت امک بغیا اور تمہارا باپ بھی اچھا تھا اور ماں بھی اچھی تھی **مسلمانو** غور کرو کہ حضرت مسیح کی پیدائش کو خدا نے بلا وساطت مرد کے محض اپنی قدرت کی نشانی بنایا ہے اور آپ کی نانی کو قرآن میں ما کانت امک بغیا کہا ہے لیکن مرزا صاحب حضرت مسیح کی نانی کو کسبی قرار دیتے ہیں بلکہ بزعم اپنی کئی پشت تک یہی سلسلہ قرار دیتے ہیں اور خود مسیح علیہ السلام کو یوسف نجار کا بیٹا کہتے ہیں۔ کیا یہ قرآن کی تکذیب اور آیات اللہ کے ساتھ استہزاء اور ایک جلیل القدر نبی کی توہین نہیں ہے۔ بہرکیف حضرت مریم نے قوم کو اشارہ کیا کہ خود اس بچہ سے پوچھو۔ فاشارت الیہ قالوا کیف نکلم من کان فی المھد صبیا جس پر

قوم نے یہ جواب دیا کہ بھلا طفل نوزائیدہ سے ہم کیا پوچھین۔ مختصر یہ کہ حضرت مسیح نے انی عبد اللہ الخ کہکر قوم کا استعجاب دفع کیا اور اپنے والدہ محترمہ کی عصمت پر شہادت دی باوجود ان نصوص صریحہ کے نہ معلوم کیون مرزائیون کو حضرت مسیح سے عداوت ہی جو ان کی توہین سے باز نہین آتے اور اس قسم کے خلاف قران و مملو من الغفلا عقائد کے معتقد ہوکر یہ حضرات کیون دائرہ ارتداد میں داخل ہوتے ہین اور اپنے اعمال صالحہ کے قدر و قیمت کو برباد کرتے ہین۔

واضح ہو کہ مرتد کے متعلق امام فخر الدین تفسیر کبیر جلد اوّل صفحہ ۷۵۴ مین تحریر فرماتے ہین۔

یحبط اعمال المرتد فی الدارین اما حبوط الاعمال فی الدنیا فهو انه یقتل عند الظفر به ویقاتل الی ان یظفر به ولا یستحق من المومنین موالاة ولا ثناء حسنا وتبین زوجته منه ولا یستحق المیراث من المسلمین اما حبوط اعمالهم فی الاخرة فبما قال تعالی اولائک اصحاب النار هم فیها خالدون ط ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هدیتنا وهب لنا من لدنک رحمة انک انت الوهاب۔

قال عز اسمه وان منکم الا واردها کان علی ربک حتما مقضیا (سورہ مریم) یعنی ہر شخص کا ورود جہنم مین ہوگا۔ یہ اللہ کا حتمی وعدہ ہی، اکثر مفسرین کی رائی یہ ہی کہ جملہ انسان خواہ مومن ہو خواہ کافر جہنم مین داخل کیا جائیگا لیکن مومنون کو تکلیف نہوگی پھر مسلمان نکال دئے جائیں گے، اور کفار اسی مین چھوڑ دئے جائیں گے شاید اس ورود سے یہ مطلب ہو کہ مسلمانون کو جہنم سے نکلنے کے بعد نعیم جنت کی قدر ہو جائے اور فرحت وسرور زیادہ ہو جاوی اور کفار کی حسرت زیادہ ہو جائے۔

قال عز اسمه فقبضت قبضة من اثر الرسول فنبذتها وکذالک سولت لی نفسی (سورہ طہٰ) یعنی جب موسیٰ علیہ السلام کوہ طور سے واپس آئے اور قوم کو گئو

سالہ پرستی میں مشغول پایا تو آپ کو غصہ آیا۔ قوم نے کہا کہ مجھے سامری نے یہ بتلایا ہے
کہ یہی گوسالہ موسیٰ کا خدا ہے لہٰذا ہم سب لوگ سامری کے کہنے سے اس کی پرستش
کرتے ہیں۔ الغرض جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری سے پوچھا کہ تو نے یہ کیا کیا
سامری نے یہ جواب دیا کہ میں نے ایک مٹھی وہ سبزہ (جو کہ دریائے نیل سے عبور کرتے
وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے جائے زیر قدم میں جم جاتا تھا) اپنے ساتھ لایا
تھا اور اسی کی آمیزش سے ہم نے اس کو بنایا ہے اور میرے نفس کی یہ خواہش ہوئی کہ
اس کی پرستش بھی کروں۔ آخیر سامری کا قصہ تو قریب قریب ہر خواندہ مسلمان کو معلوم ہے
اور یہ جو کچھ کہ ہم نے اس آیت کے متعلق اب تک نقل کیا ہے یہ عامہ مفسرین کی رائے تھی
لیکن فقبضت قبضۃ من اثر الرسول کی جو تفسیر کہ ابو مسلم اصفہانی نے کی ہے اور امام فخر الدین
رازی نے بھی جس کو بہت پسند کر کے مرجح قرار دیا ہے وہ یہ ہے کہ فقبضت قبضۃ من
اثر الرسول۔ یعنی سامری نے یہ جواب دیا کہ میں نے آپ کے عادات اور خصائل کی
تقلید و پابندی بہ نسبت دیگر افراد امت کے بہت زیادہ کی ہے پس بوجہ اس محنت و ریاضت
کے مجھکو یہ کمال ہو گیا ہے کہ میں جس چیز کی طرف ہمت صرف کرتا ہوں اُس کو حاصل کرتا
ہوں چنانچہ یہ بھی میری ہمت اور توجہ کا نتیجہ ہے کہ میں نے یہ ایک گویا اور حیرت انگیز
گوسالہ تیار کیا ہے اور جب اس اعجوبہ چیز کو بنا لیا تو پھر اس وقت تقاضائے نفس یہ ہوا
کہ اس کی خود بھی پرستش کروں اور دوسروں کو بھی گوسالہ پرستی کی ترغیب دوں
الغرض اس تفسیر کی بنا پر یہ بات معلوم ہوئی کہ فیض محبت کو بہت کچھ دخل ہے اور کسب
و ریاض کا ثمرہ بھی ضرور ملتا ہے لیکن انسان کو اپنے کشف و کرامت پر ناز نہیں کرنا چاہئے
بلکہ خدا سے ہر وقت ڈرنا ضرور ہے کیونکہ اعتبار خاتمہ پر ہے اگر خاتمہ اچھا ہوا تو سب اچھا
ہے ورنہ سب بیکار، دیکھو سامری نے بدولت اپنی ریاضت کے کیسا کمال حاصل
کیا تھا مگر آخر وقت شیطان کا وار اس پر چل گیا اور وہی سامری جو کسی وقت صاحب

سراسر سرامت تھا اب وہ مصداق خسر الدنیا و الاخرۃ ہی بلکہ خواص کو تو باعتبار عوام کے اور بھی زیادہ خائف رہنا چاہیئے کیونکہ نزدیکان را بیش بود حیرانی

قال عزاسمہٗ ۔ وعصی ادم ربہ فغوی سورہ طٰہ ۔ گرچہ اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہی کہ حضرت آدم علیہ السلام سے گناہ صادر ہوا ہی لیکن کسی انسان کو یہ اختیار نہیں ہی کہ ان کو خاطی یا غاوی کہے اللہ پاک سب کا خالق اور مالک ہی اس کو یہ زیبا ہی کہ اپنی مملوک کو جو چاہے کہے، اور جیسا چاہے رکھے۔ وجہ اس کی یہ ہی کہ اگر اتفاقاً کسی نے ایک مرتبہ مثلاً کپڑہ قطع کرکے اور ٹانکا بخیہ دیکر تیار کر لیا تو عرفاً ایسا شخص خیاط اور درزی نہیں کہلاتا ہی جب تک کہ وہ اس کام کو برابر نہ کیا کرے اور اصطلاح شریعت میں بھی گناہ اسی کو کہتے ہین کہ جو نافرمانی خدا کی عمداً و قصداً ہو بطور سہو و نسیان و غلطی نہ ہوئی ہو اور باعث مخالفت مطاع کی عظمت و محبت بھی نہو، اور جو نافرمانی کے بوجہ غلطی ہو یا بہ سبب کمال محبت مطاع کے ہو اس کو لغزش کہا کرتے ہین چنانچہ یہ فعل حضرت آدم کا یقیناً بوجہ سہو و نسیان کے تھا جیسا کہ خود قران نے بتایا ہی کہ فنسی ولم نجد لہٗ عزما یعنی آدم بھول گئے اور مین نے ان میں قصد گناہ نہیں پایا ۔ درحقیقت یہ خطا اجتہادی تھی جو کمال محبت الٰہی مین بشوق حصول خلود یا ملکوتیت کے حضرت آدم سے صادر ہوئی ۔

قال عزاسمہٗ ومن اعرض عن ذکری فان لہٗ معیشۃ ضنکا (سورہ طٰہ) جو کوئی اللہ کے ذکر و یاد سے غافل ہوگیا اس کی روزی تنگ کردی جاتی ہی اور تنگی مصیبت کی تین صورتیں ہین یا دنیا میں یا آخرت مین یا قبر مین ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہین کہ گناہ کی ایک سزا یہ بھی ہی کہ گناہگار کو رزق حلال طریقہ سے نہین ملتا ہی بلکہ اس کی آمدنی حرام ذرایع سے ہوگی ۔ اسی حدیث سے یہ شبہ بھی رفع ہوگیا کہ اس زمانہ میں کفارون اور ناپرہیزگارون کو دولت کی بڑی ترقی ہی اور اللہ کی یاد کرنیوالون کو کم ۔ کیونکہ اگر غور سے دیکھا جاویگا تو یہ معلوم ہو جائیگا کہ ان ناخدا

آدمیون کی اکثر آمدنی وجہ غیر مشروع سے ہی جو کہ بجائے خود ایک سخت سزا اور اس دولتمند کی حقیقی ناکامی ہی ترقی اور انعام نہیں ہی کیونکہ بوجہ حرام دولت کے یہی ترقی باعث وبال زندگی اخروی ہو جائیگی آجکل من کل الوجود رزق حلال کے طالب علی العموم قوت لایموت ہی پاتے ہین ہان کچھ آدمی ایسے بھی ہین کہ جن کی آمدنی حلال بھی ہو اور پھر زیادہ بھی ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء ؎ شہپر زاغ و زغن زیبا صید و قید نیست این کرامت ہمرہ شہباز و شاہین کردہ اند۔

مخلوق من الماء

قال عز اسمہ وجعلنا من الماء کل شیئ حی افلا یومنون (سورہ انبیاء ۱)

ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندہ کیا ہی پس مجھپر ایمان کیون نہین لاتے ہین۔ اب اگر کوئی یہ کھے کہ بہت چیزین عالم مین ایسی بھی ہین جن کی تخلیق مین بظاہر پانی کو دخل نہیں ہے جیسے آگ، پتھر، و اسمان وغیرہ۔ بلکہ بعض جانداروں کا غیر مخلوق من الماء ہونا نص سے ثابت ہی کما قال تعالے والجان خلقناہ من قبل نار السموم۔ یعنی جنات کو ہمنے تم سے قبل شعلہ آگ سے پیدا کیا ہو اور حدیث سے یہ بات ثابت ہی کہ خدا نے فرشتوں کو نور سے پیدا کیا لہذا ان دونون آیتون میں اختلاف اور تعارض ہی اس کا ایک جواب تو یہ ہی کہ پانی سے بنانے کی دو صورت ہی یا تو ابتداء تکوین اور تخلیق میں وہ محتاج ہو پانی کا۔ یا بقائے حیات مین وہ محتاج ہو پانی کا۔ تو اب ثقلین یعنی جنات اور انسان دونون اپنے اپنے وجود شخصی اور بقائے شخصی میں اسی اصول کے ماتحت ہین بلکہ اجنہ تو بوجہ آتشی مزاج ہونیکے اور بھی اپنی بقا مین پانی کے زیادہ محتاج ہین۔ پس والجان خلقناہ من قبل من نار السموم۔ سے تو ابتدائی آفرینش ان کی مذکور ہی جیسے کہ انی خالق بشرا من طین سے ابتدائی آفرینش انسانی کا بیان ہی یعنی جس طرح سے ابو البشر بلا واسطہ اب منی کے محض 2
تراب سے پیدا ہوئے ہین مگر ان کی اولاد اب منی سے پیدا ہوتی ہی اسی طرح سے ابو الجان ابتداءً بلا وساطت اب نطفہ کے نار سے پیدا ہوا ہو گا لیکن اب جناتون کی اولاد برابر بذریعہ

اب منی کے پیدا ہوتی ہے۔ اب معترض اگر یہ کہے کہ ہم نے ثقلین کا مخلوق من الماء ہونا تو تسلیم کیا لیکن پھر بھی وجعلنا من الماء کل شیئ حی میں تو دعویٰ کلیت کا ہے دو چیزون کے مخلوق من الماء ہونے سے کلیت وعموم کا ثبوت کیونکر ہو جائیگا اسکا جواب چند مقدمات واجب البیان کے بعد باسانی تمام ذہن نشین ہو جائیگا۔

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ یہ کارخانہ دنیا محض عبادت خدا کے واسطے قائم ہوا ہے دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ ساکنان روئے زمین میں سے صرف ثقلین ہی مکلف بالشرع اور مامور بالعبادات ہین اور یہی مخاطب بالقران ہین۔ گرچہ جمیع من فی الارض اللہ کی تسبیح کرتے ہیں مگر خاصکر بغرض عبادت کے ثقلین ہی کی تخلیق ہوئی ہے جیسا وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون سے ثابت ہے تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ جملہ اشیاء مخلوق فی الارض صرف انسان کی ضرورت اور خدمت کے لیئے ہین جیسا کہ خدا نے اپنی نعمتون کو بیان کر کے ثقلین کو مخاطب کیا ہے کہ فبای آلاء ربکما تکذبان تم دونون میری کن نعمتون اور احسانات کو جھٹلاؤ گے

ان مقدمات کے بعد عرض ہے کہ ثقلین کا مخلوق من الماء ہونا تو قبل معلوم ہو چکا ہے اور ان مقدمات سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ باقی اشیاء تابع اور خادم ہین لہذا یون بھی کہہ سکتے ہین کہ ہم نے ہر شی کو پانی سے زندہ کیا ہے کیونکہ توابع کا اعتبار مستقلاً و بالذات تو ہوتا نہین ہے بلکہ اصول کے ماتحت ہوا کرتے ہین۔ جیسے کسی نے ایک معزز مہمان کی دعوت کی اور اس مین مثلاً دس من کی یخنی ہوئی جس مین لکڑی وغیرہ بھی ضرور صرف ہوئی مہمانون کی آمد و رفت مین موٹر مین پٹرول کا بھی خرچ ضرور ہوا۔ اور بھی بہت سی چیزین اسی قسم سے اگرچہ مہمان نے سب کو کھایا نہین بلکہ بہت چیزین اس میں کھانے کے لائق بھی نہ تھین لیکن پھر بھی یہ کہتے ہین کہ فلان مہمان کے کھانے مین میرا اتنا خرچ ہوا علاوہ اس کے خود اس آیت مین لفظ حیّ موجود ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ خطاب بمقابلہ اہل دنیا کے ہے جسکا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اے ساکنان روئے زمین دیکھو

جمیع جانداران ارضی کو ہم نے نطفہ سے پیدا کیا ہے اور یہ مطابق واقعہ کے ہے کہ جمیع حیوانات کے پیدائش میں نطفہ کو تعلق ہے باوجودیکہ نطفہ سیّال اور یکرنگ ہوتا ہے لیکن اسی ایک رنگ کے نطفہ سے کیسی کیسی صورتیں بنائی ہیں بلکہ ایک ماں باپ کی اولاد میں ایکدوسری سے ممتاز ہو جاتا ہے پس خدا کی قدرت نہیں ہے تو کس کی قدرت ہے ؟ ہے لہٰذا خدا پر ایمان لاؤ۔ اور ملائکہ چونکہ عالم بالا کے رہنے والے ہیں وہ اس تذکرہ میں شامل نہیں ہیں۔ بلکہ جانداران روئے زمین کے سوا بھی بہت چیزوں کی بقا اور تازگی کو ہم پانی سے پاتے ہیں کیونکہ آیت میں لفظ جعلنا ہے خلقنا نہیں ہے۔ پس دیکھو بولتے ہیں کہ اس موتی میں آب نہیں ہے اس یا قوت کا آب جاتا رہا ہے حالانکہ یہ سب غیر ذی روح ہیں مگر ایسا بولتے ہیں اور جس موتی یا جواہرات وغیرہ کا آب جاتا رہا ہو اس کی قیمت بھی کم ہو جاتی ہے گویا کہ وہ مردہ ہو جاتا ہے یعنی ہر چیز کے لائق جو کسی حیات اور تازگی درکار ہے اس کو تعلق پانی سے ہے اور زمین کی زندگی تو سارے کاشتکار پانی سے دیکھتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں گر چونکہ قرآن مجید ہر درجہ کے لوگوں کی سمجھ کے موافق ہدایت کرتا ہے اور اس کی ایک آیت دوسرے کی تفسیر ہے لہٰذا آیت زیر بحث کو بھی سورۂ نور میں اس طرح سے واضح کر دیا ہے کہ واللہ خلق کل دابّۃ من ماء یعنی اللہ نے روئے زمین کے ہر جاندار کو پانی سے یعنی نطفہ سے پیدا کیا ہے دہد نطفہ را صورتے چون پری + کہ کردہ ست بر آب صورت گری، اور یہ قاعدہ ہے کہ اخبار میں عام کو خاص پر اور مطلق کو مقید پر عند الضرورت محمول کر لیتے ہیں بلکہ بعض مجتہدون کے نزدیک تو آیت مطلقہ متعلق احکام بھی علی العموم مقیدہ پر محمول ہے پس سورۂ انبیاء کی آیت گرچہ مطلق ہے لیکن وہ سورہ نور کی آیت مقیدہ پر محمول ہونیکی وجہ سے قرینہ مخصصہ کو قبول کرتی ہے۔ لہٰذا یہاں بھی جعلنا کو بمعنی خلقنا اور کل شیٔ کو بمعنی کل دابّۃ سمجھو۔ الغرض قرآن مجید کے کسی مضمون پر اعتراض وارد نہیں ہوتا ہے جس لحاظ سے دیکھا جائے درست و صحیح ہے ہرگز کسی آیت میں حقیقی اختلاف نہیں ہے یہاں پر اور بھی دلچسپ مضمون کی گنجائش

بھی مگر بخوف طوالت میں نے ترک کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

قال عز اسمہٗ۔ ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ ۔ سورہ انبیاء یعنی
قیامت کے دن ہر شخص کے اعمال کا وزن عدالت کے ساتھ کیا جائیگا اب بظاہر اس کو
فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنا سے تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ مومن
اور کافر دونوں کے اعمال تولے تو ضرور جائیں گے مگر چونکہ کفار کے اعمال کی کوئی قدر
ومنزلت نہیں اس لحاظ سے گویا وہ بے وزن ہے جس کا تذکرہ فلا نقیم لھم یوم القیامۃ
وزنا سے کیا گیا ہے ورنہ درحقیقت کفار کے وزن اعمال کا انکار نہیں ہے۔

قال عز اسمہٗ۔ یا ایھا الناس اتقوا ربکم ان زلزلۃ الساعۃ شیٔ
عظیم۔ سورہ حج ترجمہ اے لوگو، خدا سے ڈرو تحقیق کہ قیامت کا زلزلہ ایسا سخت ہونے
والا ہے کہ اس دن دودھ پلانے والی عورتیں بچوں کو بھول جائیں گی اور حاملہ کا حمل ساقط
ہو جائیگا۔ گرچہ اس آیت میں قیامت کبریٰ کی خبر دی گئی ہے اور اسی کی علامتیں بیان
ہوئی ہیں۔ مگر چونکہ موت بھی قیامت صغریٰ ہے۔ کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من مات
فقد قامت قیامتہٗ۔ لہذا قیامت صغریٰ پر بھی اس کا مضمون اس طرح سے چسپاں ہوتا ہے
یعنی اے لوگو ڈرو اپنے رب سے کیونکہ عنقریب تمہارے جسم میں موت کا ایک بڑا زلزلہ
آنیوالا ہے یعنی جس وقت کہ موت قریب آجاتی ہے اس وقت ہر قوی غاذیہ اپنے شیرخواروں
سے غافل ہو جاتے ہیں وتضع کل ذات حمل حملھا اور جملہ قوی حاملہ مثلاً حافظہ
ومدرکہ وخیال وغیرہ اپنے اپنے محمولات اور مدرکات کو چھوڑ دیتے ہیں یا یوں کہو کہ
ان قوی حاملہ کا اسقاط حمل ہو جاتا ہے اور ہر نفس نے جو کچھ کہ اٹھا رکھا تھا خواہ فضائل
ہوں یا رزائل سب کا اظہار ہو جائیگا کیونکہ مرنیوالا بوقت قرب موت کے اپنے اعمال
کے اطفال کی صورت دیکھ لیتا ہے یعنی اعمال صالحہ کی صورت مثالی حسین ودلکش دیتی
ہے اور اعمال قبیحہ کی صورت بد وتکلیف دہ نظر آتی ہے بلکہ ملائکہ قابض الارواح بھی نیکوں

کی جان نکالنے کیواسطے خوشنما اور دلفریب شکلون مین آتے ہین اور بدکار لوگوں کی روح قبض
کرنے کو خوفناک شکل مین اور پھر اس بدکار روح کو بدبو ٹاٹ مین لپیٹ کر لیجاتے ہین بس
اس وقت مرنیوالے کی کیفیت نشیلی ہو جاتی ہو حالانکہ وہ نشہ کوئی شراب کا نہیں ہوتا
ہو لیکن شخص قریب المرگ اس وقت اپنے اعمال کے ناکارہ اور بدشکل بچون کو دیکھ کر جب
عذاب آخرت کا تصور کرتا ہو تو مثل سکران کے مدہوش ہو جاتا ہو کیونکہ اب چارہ کار کا
بھی وقت نکل چکا ہو۔

قال عز اسمہٗ وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان
فی امنیتہ الخ (سورہ حج) یعنی ہمنے آپسے قبل جس رسول یا نبی کو بھیجا ہو اور جب کبھی
کسی خواہش میں اُن کے شیطان نے وسوسہ ڈالنا چاہا بس اللہ نے اپنے رسول اور نبی
کی مدد اس طریقہ سے کیا کہ وسوسہ کی طرف آپ کو متوجہ نہ ہونے دیا اور بوقت عمل کے
وسوسہ کا کوئی مضمون یاد بھی نہین رکھا۔ عام طور سے یہ بات مشہور ہو کہ حضور نبی کریم
صلے اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ سورہ نجم کی تلاوت فرما رہے تھے اور مشرکین مکہ بھی وہاں پر
موجود تھے جس وقت حضور اس آیت پر پہونچے ' افرءیتم اللات والعزیٰ و
منٰوۃ الثالثۃ الاخرٰی ۰ بس شیطان نے تلک الغرانیق العلےٰ ان
شفاعتھن لترتجی ۰ پڑھ دیا تھا بس اسی واقعہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی تھی لیکن
علماء محققین مثلاً فخر الدین رازی وغیرہ نے اس روایت کو بدلائل عقلی اور نقلی موضوع قرار
دیا ہو کیونکہ بصورت صداقت اس روایت کی احکام شریعت سے امان اٹھ جاتا ہو لہٰذا مطلب
صحیح اس کا یہ ہو کہ چونکہ انبیاء علیہم السلام بھی بشر ہین اور تقاضا بشریت سے جب وہ کسی
کام کو دل میں سوچتے ہین تو شیطان چاہتا ہو کہ اس کام میں کوئی وسوسہ اپنے مطلب کی
موافق ڈالدے لیکن اللہ کی مدد سے یہ حضرات اس وسوسہ کی طرف آمادہ و متوجہ نہین
ہوتے ہین ' اور آدم علیہ السلام کے واقعہ سے اس کو تعارض نہیں ہو اس لئے کہ اولاً تو وہ

قصہ قبل نبوت کا ہے۔ اور اس آیت میں بحالت نبوت و رسالت کے انبیا علیہم السلام کے احکام مذکور ہیں۔ نبی اور رسول میں فرق یہ ہے کہ رسول صاحب معجزہ اور صاحب کتاب ہوتے ہیں۔ لیکن نبی کے لیے صاحب کتاب ہونا ضرور نہیں ہے۔

قال عز اسمہ فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینہم ولا یتساءلون (سورہ مومنون) بظاہر اسکو واقبل بعضہم علی بعض یتساءلون۔ سے جو تعارض معلوم ہوتا ہے۔ اسکا جواب اسی کتاب میں قبل مذکور ہو چکا ہے۔ ہاں فلا انساب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں مجرد رشتہ ناتا کافی نہیں ہوگا۔ بلکہ رشتہ اور خاندان اور قبائل تو صرف دنیا میں شناخت اور پہچان کے لیے

بنایا گیا ہے۔ کما قال تعالیٰ یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ

وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ

اتقاکم ان اللہ علیم خبیر ۵ ورنہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت اسکی ہے جو اللہ سے زیادہ ڈرتا ہو۔ اگر کوئی نبی کا بیٹا ہے لیکن خود بے دین ہے تو اس رشتہ سے اسکا کوئی کام نہیں نکلیگا۔ دیکھو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹا کنعان کو پیغمبر زادگی سے کیا نفع ملا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

باپ کو حضرت خلیل کی نبوت سے کیا فائدہ پہونچا۔ بلکہ کل نفس بما کسبت رہینۃ۔ ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا ثمرہ پاویگا۔ (رباعی الراقم)

ابا کے فضائل پہ ہے ناز پسر کو + ہے جوہر ذاتی تو دکھا اہل ہنر کو!
کنعاں میں کوئی بات نہیں نوح نبی کی + نیسان کا ہر ایک قطرہ نہیں پہنچا گہر کو

باوجود ان باتوں کے بھی اکثر بزرگ زادوں کا یہ حال دیکھا جاتا ہے کہ اعمال صالحہ سے انہیں ایسی غفلت اور لاپروائی ہو گئی ہے کہ ان کو اسلام کے عقائد سے بھی آگاہی نہیں اور وضع بھی کچھ ایسی کہ جس کو

دیکھکر نا آشنا شخص ان کو مسلمان بھی سمجھ نہیں سکتا ہی۔ بلکہ جب نام دریافت کرلیتا ہی تو لوگ نام سے ان کے مذہب کو قیاس کرلیا کرتے ہیں۔ اور ان کی مستورات کا وہ لباس جو عاریات کاسیات والی حدیث کا مصداق ہی یعنی وہ کرتا جو بحالت انگڑائی موجب بے ستری اور ایسی باریک ساریاں جو کہ شرعاً ممنوع الاستعمال لیکن نہ انھیں اس کے حرمت کی پروا اور نہ اس ناجائز ملبوسات کو چھوڑا انکی قدرت اور نہ عورتیں اس کے ترک پر آمادہ۔ اللہ اکبر! ممنوعات شرعی سی رغبت کن گھروں تک جا پہنچی جنکے آبا و اجداد ہادی دین تھے۔ حالانکہ ان لوگوں کو صلاح و تقویٰ میں اپنے آبار کے نقش قدم پر چلنا زیادہ ضروری تھا۔ اب کس آئیت کی رو سی وہ اپنے کو دوسرے سے بربنار بزرگ زادگی کے افضل اور واجب الاحترام سمجھتے ہیں ؎

اے بسا مہتر پسر کز شور و شر ٭ شد ز فعل زشت خود ننگ پدر

ہاں جو لوگ کہ خود بھی موصوف بالکمال اور پابند مذہب ہیں اور ان کے آبار بھی اپنے وقت میں مقتدار دین گذرے ہیں پس ایسے لوگ ضرور واجب الاحترام ہیں اور ان لوگوں کو البتہ ترقی مدارج میں ان رشتہ و قرابت سی کام نکل جانا قرین عقل ہی کیونکہ جب ہر مطیع کے لئے انبیار اور صدیقین۔ اور شہدار و صالحین کے قرب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ کما قال تعالیٰ ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء والصالحین وحسن اولئک رفیقاً۔ تب جو آدمی کے مطیع ابن المطیع ہی۔ اس کے مدارج کا پوچھنا کیا ہی۔ ورنہ صرف پدرم سلطان بود سے کوئی نتیجہ مفید نکلنے والا نہیں ہی جاہل اور بدکار پیغمبر زادوں کی تعظیم اور توقیر کرنیوالا ان کی غفلت اور تمرد میں انکا معین جرم ہی۔ بلکہ ان لوگوں کو غیرت دلاکر اپنے بزرگوں کے

قال عز اسمہ الزانی لا ینکح الا زانیۃ او مشرکۃ والزانیۃ لا ینکحہا الا زان او مشرک ج وحرم ذلک علی المومنین (سورہ نور) مطلب یہ ہی کہ فاسق اور زانی کو اچھی اور پاکدامن عورت سے نکاح کی رغبت کم ہوتی ہی۔ بلکہ ایسے لوگوں کا میلان طبعی زانیہ اور فاسقہ کی طرف زیادہ ہوتا ہی اور مومنوں پر یہ طریقہ حرام ہی کہ صرف زانیہ اور فاسقہ سے نکاح کیا کریں۔ اور نیک بخت اور پاکدامن عورتوں سے نفرت کریں۔ حرم کا یہ مطلب نہیں ہی کہ کوئی زانیہ یا کوئی طوائف اگر توبہ کرے تو بعد اس توبہ کے بھی اس سے نکاح کرنا مسلمانوں کو منع ہی بلکہ صرف لوگوں کا رجحان طبعی بتایا گیا ہی۔

قال عز اسمہ الخبیثات للخبیثین۔ (سورہ نور) یعنی خبیث باتیں جیسے قصہ افک یہ خبیث آدمیوں کا بنایا ہوا ہی۔ اور وہ حضرات جو منکرین افک ہیں وہ ان خبیثوں کے اقوال خبیثہ سے پاک اور بیزار ہیں جن لوگوں نے یہ سمجھا ہی کہ الخبیثات للخبیثین کا مطلب یہ ہی کہ بدوضع مرد کی عورت بھی بدچلن ہوتی ہی اور متقی مرد کی بیوی بھی پاکدامن ہوتی ہی یہ غلط ہی۔

قال عز اسمہ ولا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء ان اردن تحصنا۔ (سورہ نور) ترجمہ اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاکدامنی چاہتی ہوں، اب اگر کوئی یہ شبہ پیش کرے کہ جو لونڈیاں زنا پر رضامند ہوں تب تو اونکو زنا پر مجبور کرنیمیں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیئے۔ حالانکہ لونڈیوں کو زنا سے ہرحال میں روکنا ضرور ہی۔ پھر اس آیت میں ان اردن تحصنا کس لیئے کہا گیا۔ اسکا ایک جواب تو یہ ہے کہ جو صورت معترض نے پیش کی ہی وہ فی نفسہا ممکن الوقوع نہیں ہی کیونکہ جو لونڈی زنا پر رضامند ہو اسکو مجبور کیونکر کیا جا سکتا ہی۔ وہ فعل تو جب اس کے نزدیک مرغوب ٹھہرا تو پھر مجبوری متصور کب ہی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک آدمی

عبداللہ بن ابی منافق تھا۔ اور اس کے پاس کیک پاکدامن لونڈیاں تھیں جنکو وہ
زنا پر مجبور کیا کرتا تھا۔ ایکمرتبہ ان لونڈیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں شکایت کی پس اُسی امر خاص کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ چونکہ واقعہ
خاص اسی طرح کا تھا۔ اس لیئے عنوان بیان ایسا ہے ورنہ شریعت اسلام میں زنا
ہمیشہ اور ہر حالت میں حرام ہے۔

قال عز اسمہ لیس علی الاعمیٰ حرج ولا علی الاعرج حرج ۰ ولا
علی المریض حرج ولا علی انفسکم ان تاکلوا من بیوتکم او بیوت
اٰبائکم الاٰیہ (سورۂ نور) اس آیت میں دو حکم تبلایا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ نابینا
اور مریض پر ترک جہاد میں کوئی مضایقہ نہیں ہے۔ اور دوسرا حکم ان تاکلو سے
شروع ہوتا ہے۔ یعنی اپنے گھر میں یا باپ کے گھر میں یا چچا ماموں یا بھائی یا دوستوں
کے یہاں کھانے میں کوئی ہرج نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ پہلے یہ دستور تھا کہ آدمی
کسی غریب یا مسکین کو اپنے ساتھ لیکر اپنے گھر میں یا برادری والوں میں لیجاتا تھا
اور اُسکو کھانا کھلا دیتا تھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ لا تاکلوا اموالکم بینکم
بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم تو لوگوں نے اس طریقہ
مروجہ کو ڈر کر چھوڑ دیا۔ پس بذریعہ اس آیت کے یہ بتلا دیا گیا کہ اسمیں کوئی مضائقہ
نہیں ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کے یہاں کھانا اکل بالباطل کے تحت میں نہیں ہے۔

قال عز اسمہ فی بیوت اذن اللہ ان ترفع ویذکر فیہا اسمہ
یسبح لہ فیہا بالغدو والاٰصال رجال لا تلھیھم تجارۃ ۰
ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ یخافون
یوماً تتقلب فیہ القلوب والابصار (سورۂ نور) مسجدوں
میں کچھ ایسے لوگ بھی اللہ کی تسبیح کرنیوالے ہیں کہ جنکی رغبت تجارت اور بیع

کیطرف نہیں ہی۔ بوجہ مشغولیت ذکر خدا اور ادا نماز اور ادائے زکوۃ کے۔ اور مسجد و نکے بنانیکی اجازت خدا نے محض اسی کام کے لیئے دی ہی تاکہ اسمیں خدا کی یاد ہو اور صبح و شام اسکی تسبیح پڑھی جاوے۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے چند قول ہیں جنکو نقل کرنا باعث طوالت ہی۔ اور نہ مجھکو ان تفسیر دل سے اختلاف یا انکار ہی مگر چونکہ قرآن مجید ہر طبقہ اور ہر قسم کے لوگوں کے واسطے ہدایت ہی اور اس آیت کے اوپر خود مذکور ہی کہ ویضرب اللہ الامثال للناس ط واللہ بکل شئ علیم۔ کہ لوگوں کے سمجھنے اور سمجھانے کے واسطے قرآن میں اکثر مثالیں لائی گئی ہیں۔ لہذا راقم الحروف کے ذہن میں جو بات آئی ہی۔ اسکو گذارش کرتا ہی۔ واضح ہو کہ اس آیت میں تحسین اور تعریف ایسے مردوں کی کی گئی ہے کہ جنکو بوجہ ذکر خدا اور ادا نماز اور ادائے زکوۃ کے تجارت وغیرہ کا موقعہ نہیں ملتا ہے جیسے کہ اصحاب صفہ کی شان تھی اور یہ صفتیں جنکا ذکر اس آیت میں ہی اصحاب صفہ میں پائی جاتی ہیں کیونکہ اونکے قلوب مساجد سے متعلق رہا کرتے تھے۔ اور یہ شغلہ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ تجارت تو بڑی چیز ہے بلکہ ان اصحاب کو معمولی طور سے خرید و فروخت کی بھی نوبت نہیں آتی تھی حالانکہ ضروریات زندگی کے خرید و فروخت کا اتفاق تو غیر تجار کو بھی پیش آتا ہے۔ مگر جب کہ وہ کسی قسم کا سامان نہیں رکھتے تھے تو پھر اس کی نوبت کیونکر آتی چنانچہ اصحاب صفہ کے ناداری کی یہ حالت تھی کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہمنے ستر شخص کو اصحاب صفہ سے اس حال میں دیکھا کہ جنمیں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کو کہ کوئی چادر بھی ہو، بلکہ صرف ایک کپڑہ ان لوگوں کو ہوتا تھا۔ خواہ وہ لنگی ہوتی یا کمل جسے گردن سے باندھ رکھتے اور وہ کسی کے نصف پنڈلی تک پہونچتا تھا۔ اور کسی کو اس سے اوپر تک اور نشستہ میں یا ادا ارکان نماز میں

کبھی بے ستری کے خوف سے اسکو ہاتھ سے پکڑ لیا کرتے تھے۔ رواہ البخاری۔
اب ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں ممدوح خواہ اصحاب صفہ ہوں یا کوئی دوسری جماعت مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ غریب ہیں اور غربت بھی ان کی اس حد تک ہے کہ جنکو معمولی خریداری کی بھی نوبت آتی ہے۔ پھر ادا زکوۃ کا کیا مطلب ہوگا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کے پاس قابل نصاب دولت کہاں سے آئی کہ وہ ادا زکوۃ میں مشغول ہوتی۔ اور مانا کہ کسی مرید یا معتقد نے کچھہ نذرانہ پیش کیا تو یہہ عاشقان رسول اسکو کب گوارا کرینگے۔ کہ ان روپیوں کو وہ اپنے پاس اتنی مدت تک رکھیں کہ اسپر حولان حول ہوا اور زکوۃ واجب ہووے۔ کیونکہ جب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نقدین کو اپنے پاس کبھی جمع نہ رکھا تو یہ حضرات حکم اباحت سے کب فایدہ لینا گوارہ کرتے ہونگے۔ بلکہ اس شعبۂ ایثار میں بھی سنت نبوی کے پورے پیرو ہونگے۔ یہ مالی زکوۃ تو عام مسلمانوں پر فرض ہے۔
جواب اسکا یہ ہے کہ بیشک اس آیت میں مثال ایسے لوگوں کی لائی گئی ہے جسکی حالت کے اصحاب صفہ سے مشابہ ہے۔ اور جو اپنا فخر فاقہ میں اور اپنی آبرو پیوند والے کپڑوں میں سمجھتے ہوں لیکن پھر بھی یہ حضرات زکوۃ ادا کرنیوالے کیئے گئے ہیں۔ پس یقین کرو کہ انکی زکوۃ بھی عام مسلمانوں کے زکوۃ سے علیحدہ نوعیت کی ہے کیونکہ بجز آیت قرآنی اور اسمار الٰہی کے خزانہ کے اور کوئی دوسری دولت انکے ہاتھ میں تو ہوتی نہیں ہے۔ پس جیسی دولت اسی جنس کی زکوۃ بھی سمجھو لہذا ان کی زکوۃ یہ تھی کہ اسمار حسنی کے ورد میں اپنا سارا وقت صرف کرتے تھے۔ چنانچہ ابتک بھی صوفیائے کرام کے یہاں اسم ذات و اسمار حسنی و آیات قرآنی کے زکوۃ کا مختلف طریقہ مروج ہے اور اصطلاح تصوف میں اسکو زکوۃ ہی کہا کرتے ہیں۔ گرچہ وہابیوں نے تو مشائخ رح کے اکثر اعمال مخصوصہ کو بدعت

سیئہ کہدیا ہے۔ حالانکہ اگر کسی صوفی نے مثلاً سورہ اخلاص کو دولاکھ مرتبہ ایک
چلہ میں ختم کرنا کسی خاص کام کے لئے ضروری کردیا تو اس سے دین میں کیا خرابی
آگئی میرے سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے۔ بلکہ قیاس یہ کہتا ہے کہ اس کی تاثیر کے
زیادتی کا یہ باعث ہوجائیگا۔ کیونکہ ادویہ ظاہری میں تو ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ تقطیر
یا احراق یا کشید یا سحق میں تعداد کو ایک خاص دخل تاثیر اسکے قوت وضعف وسرعت
وبطور میں ہوجاتا ہے۔ لہذا جو صاحب بنظر انصاف اس آیت ما نحن فیہ میں غور
کریں گے تو انکو صوفیوں کی مصطلحہ زکوۃ کا ثبوت اسمیں ملجائیگا۔ چونکہ رسالہ ہذا
میں ہمنے ایک جدید قسم کی زکوۃ کا تذکرہ کیا ہے۔ لہذا ممکن ہے کہ کوچۂ تصوف سے جو
ناآشنا ہو اُسے نہ لانے یا میری مخالفت کرے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ عموماً صوفی
مشربوں کو اور خصوصاً میرے صوبہ میں وابستگان پھلواری شریف کو اس کے تسلیم
کرنے میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ کیونکہ ناظرین رسالہ ہذا میں بعض ایسے اصحاب بھی ہونگے
کہ جنکا ذاتی تجربہ اس زکوۃ کی اہمیت اور وجود پر خود شاہد ہوگا۔ کیونکہ کئی لاکھ کی تعداد
میں درود شریف کی زکوۃ وہاں مقرر ہے اور ابتک حزب البحر کے زکوۃ کا بھی ایک
خاص طریقہ وہاں مروج ہے۔ اور میرے سلسلہ رحمانیہ میں تو ہر تار نفس
اسم ذات کے ادار زکوۃ سے وابستہ ہے۔ مختصر یہ کہ جب صرف درود شریف کے ادار
زکوۃ میں ایک وسیع قدرت درکار ہوتی ہے تو جو آدمی کے قرآن کے آیات یا سور
کی زکوۃ دیگا۔ اسکو کاروباری زندگی کا وقت کب ملیگا۔ اب سوال یہ ہے کہ اسقدر
محنت اور چلہ کشی کی ضرورت کیا ہے۔ صحابہ میں تو یہ طریقہ نہیں تھا یہ تو گویا لزوم
مالا یلزم ہے جسکا جواب یہ ہے کہ اولاً تو میں اسکو تسلیم نہیں کرتا ہوں کہ اصحاب رض
میں ایسے لوگ نہیں تھے مگر ہاں جو اس قسم کے حضرات تھے ان کی تحسین اس
آیت میں کی گئی ہے کہ البتہ سب لوگ نہ تھے۔ بلکہ کم تھے۔ کیونکہ اگر سب اسی قسم کے ہوجاتے

تو جہاد کون کرتا اور انتظام ملک کیونکر قایم رہتا اور علاوہ اس کے بہ سبب برکت
صحبت نبوی کے ان سب کو انسبات کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ وقت
ضرورت کے ہر صحابی آیت کلام اللہ سے جلد از جلد حصول مقصد پر قادر تھے
خواہ اس نے زکوۃ اس آیت کی دی ہو یا نہیں لیکن صرف ہم لوگوں کی تسلیم اور تمسک
کے لیئے ایک جماعت اصحاب صفہ کی بھی تھی اب رہی یہ بات کہ اسکی ضرورت کیوں
ہی اسکا جواب میں ایک مثال کے ضمن میں عرض کرتا ہوں فرض کرو کہ کسی غریب
کو سخت مالی ضرورت پیش آئی اور اس نے اپنا سوال بڑے رحیم دل اور سخی سے
پیش بھی کیا مگر وہ سخی خود صاحب نصاب نہیں ہی بلکہ صرف چند پیسوں کا مالک ہی
لہذا اس نے باوجودیکہ سائل کو دل کھولکر دیا بھی مگر سائل کی حاجت رفع نہوئی کیونکہ
ضرورت معمولی پیسہ دو پیسہ کی تو تھی نہیں بلکہ ضرورت اہم اور سخت تھی ہاں
ایسے ایسے چند معمولی درجہ کے اہل جود اگر ملکر کوشش کریں تب سائل کی مشکل
کشائی ممکن ہی اور اگر اس سائل نے مثلاً اپنی دو سو روپیہ کی احتیاج کو کسی کروڑپتی
کریم سے عرض کیا تو اس کروڑپتی کی ایک ادنی توجہ سے اسکا کام نکل جانا بہت آسان
ہے اسیطرح قرآن مجید سے ہر مسلمان کو خود نفع اٹھانے کا اور دوسرونکو نفع پہونچانے
کا حق حاصل ہی پس اب فرض کرو کہ کسی شخص کو کوئی ضرورت متعلق دعا کے
پیش آئی اب اگر وہ ضرورت معمولی ہی تو زید عمر جس مسلمان نے کوئی آیت پڑھکر دم
کردیا یا تعویذ لکھکر دیدیا کام نکل آیا لیکن اگر وہ ضرورت سخت ہی مثلاً دفع سحر یا ازالہ
شر اجنہ یا تسخیر قلوب وغیرہ تب تو معمولی آدمی کوئی مفید چارہ کار نہیں کرسکتا ہے
کیونکہ وہ تو خود چھوٹے پونجی کا آدمی ہی اب لامحالا اسوقت ایک قوی شخص کی تلاش
ہوئی پس اسوقت اس کام کے لیئے بڑا شخص وہی ہی کہ جس نے اسماء حسنی
وغیرہ کی زکوۃ دیکر اپنے کو اسکا صاحب نصاب بنالیا ہے اور چونکہ اس کا سرمایہ

بہت زیادہ ہوتا ہی۔ اس لیئے بہت جلد سائل کی تکلیف کو یہ دفع کر دیتا ہی۔ ورنہ یوں تو معمولی اونچی والا سیکڑوں ملکر یا سلام کا ختم پڑھے تو شاید کشود کار ہو اور یہ تو روز مرہ کا مشاہدہ ہی کہ حضرت پیر و مرشد مولانا سید محمد علی صاحب نقشبندی رحمانی کے خدمت بابرکت میں مرضا آتے ہیں اور آپ صرف پانی پر اللہ کا نام پڑھکر دیتے ہیں جس سے ایسے مریضوں کو بھی صحت ہو جاتی ہی کہ جن کے علاج سے ڈاکٹر و حکیم عاجز آچکے ہوں۔ بلکہ اطباء ظاہری اور ان معالجین باطنی میں ایک خاص امتیاز یہ ہی کہ جسمانی معالج روح کے علاج سے ہمیشہ قاصر ہے۔ اور یہ روحانی معالج جب کبھی چاہتا ہی جسم کا علاج بھی کر لیتا ہی۔ اور وہ بھی تعجب خیز طریقے سے کیونکہ جسمانی طبیبوں کا یہ دستور ہی کہ جسقدر مریض کی حالت نازک ہوتی ہی۔ اسیقدر طبیب کو مریض کے پاس موجود رہنے کی ضرورت ہوتی ہی۔ اور ان روحانی طبیبوں کو اس کی حاجت جسمانی علاج میں بھی ضروری نہیں ہی۔ بلکہ زید نے جاکر کہا کہ حضور فلاں شخص کی حالت نازک ہی۔ اس نے سینکڑوں کوس سے مرض کو سلب کر لیا اور روح کا علاج جو کہ خاص انکا کام ہے۔ اسمیں ان کے اعجاز کا کیا پوچھنا ہی چنانچہ فرماتے ہیں ؎

این طبیبان بدن دانش ورند	بر سقام تو ز تو واقف ترند
ہم ز نبض و ہم ز رنگ و ہم ز دم	بو برند از تو بعد گونہ سقم
پس طبیبانِ الٰہی در جہان	چوں ندانند از تو اسرار نہان
کاملان از دور نامت بشنوند	تا بقعر تار پودت در روند

ناظرین:۔ اب تو آپ نے صوفیوں کی زکوۃ کو غالباً بخوبی سمجھ لیا ہوگا۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ حضرت غوث پاک اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہما تو بڑے مالدار تھے تو باوجود اتنی دولت اور ثروت کے ان بزرگوں کو کیونکر موقعہ چلہ کشی اور

باطنی زکوٰۃ وہی کا ملنا تھا۔ گرچہ اسکا تفصیلی جواب توانشاءاللہ آئندہ کسی مستقل
رسالہ میں عرض کرونگا۔ مگر مختصر طور پر یہ ہی کہ مینے جو کچھ عرض کیا ہی یہ ایک آسان طریقہ
اسمار الٰہی کے زکوٰۃ کا وہی گوشہ نشینوں کا عام اصول مروجہ ہے۔ ورنہ شریعت سے
کچھ ممنوع تو ہی نہیں اور نہ عقلاً محال چونکہ امت میں ہر قسم کے لوگ ہیں اور حضور صلی
اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سب کے لیئے نمونۂ عمل ہی۔ لہذا آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے اپنی عملی زندگی میں تجارت بھی کرکے یہ بتادیا ہی کہ دیکھو سلسلۂ تجارت
میں رہ کر بھی یاد خدا اسطرح سے ممکن ہے اور اسی لیئے صوفیائے کرام کے زمرہ
میں بعض ایسے اوالعزم اور صاحب ہمت اصحاب ہوئے ہیں کہ جنھوں نے
باوجود ان تعلقات دولت کے بھی باطنی تجارت میں کامیابی حاصل کی ہی۔ اور جو
ظاہری اور باطنی دونوں دولت کے سرمایہ دار ہیں اور دونوں قسم کی زکوٰۃ ادا
کرنیوالے ہیں۔ لیکن دل بیار و دست بکار والے انسان ہر زمانہ میں کمیاب ہوئے
ہیں اور اس موجودہ زمانہ میں تو گویا عنقا صفت۔ ذرہ میں اپنے اس دعوی کی صداقت
ان لوگوں سے انصاف پر چھوڑتا ہوں جنکو کہ آجکل منصب سجادگی اور تعلق زمینداری
دونوں حاصل ہی۔ وہ خود ہی اپنے دل میں سمجھتے ہونگے کہ کیا دونوں لوازمات
صحیح طور پر ان سے ادا ہوجاتے ہیں۔ یا ایک کی نگرانی و ترقی دوسرے منصب کے
فرائض سے غفلت و کم توجہی کا باعث ہوجاتا ہے۔ سچ ہے ؎

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن!

ھذا ما سنح لی واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

قال عز اسمہ انہ تنزیل رب العالمین نزل بہ الروح الامین۔ (سورہ شعرار) قرآن شریف تو بیشک کلام خدا ہی لیکن ایک احتمال یہ تھا

کہ شاید پورا قرآن حضور پر بلا واسطہ فرشتہ کے نازل ہوا ہی۔ لہذا یہ تبلا دیا گیا کہ جبرئیل علیہ السلام اسکو لیکر آئے تھے۔ یہ آیت گویا اِنَّہٗ لَقَولُ رَسُولٍ کَرِیمٍ کی تفسیر ہے۔

قال عز اسمہ لقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا ولیعلمن الکاذبین۔ (سورۂ عنکبوت) ترجمہ:۔ ہم نے تمھارے پہلے بھی لوگوں کو جانچا ہے۔ تاکہ سچے اور جھوٹے کا امتیاز ہوجاوے۔ اسجگہ بعضوں سے ایسی غلط فہمی ہوئی ہی کہ وہ تجدد علم باری تعالےٰ کے قائل ہوگئے ہیں مگر بات یہ ہے کہ منجملہ اور صفات کے علم بھی خدا کی ایک صفت ہے اور خدا کی سب صفتیں قدیم ہیں کسی ایک میں بھی تغیر و تبدل یا کمی بیشی نہیں ہوتی ہی بلکہ وہ جملہ اشیاء کو قبل از وقوع کے اس طرح پر جانتا ہی کہ فلاں چیز فلاں وقت میں اس طرح سے واقع ہوگی اور کیول نہ ہو جبکہ معمولی انجنیر یا کاریگر بھی اتنا جانتا ہی کہ فلاں چیز فلاں وقت میں روزانہ کیا جاوے تو اس نقشہ کا مکان اتنے دن میں تیار ہوجائیگا لیکن انسان جو کچھ اپنے تجربہ اور قیاس کے بنا پر کہتا ہی اسکا وقوع متیقن نہیں ہوتا ہی کیونکہ وہ موانعات سے لاعلم رہتا ہی کہ کون کون موانعات اس اس کام کے وقوع میں پیش آوینگے۔ مگر خدا جو جانتا ہے وہ ٹھیک اسی طرح سے واقع ہوتا ہی۔ کبھی اس کے وقوع میں اختلاف نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسکا علم محیط کل ہی مثلاً قبل پیدائیش زید و ابولہب کے وہ جانتا تھا کہ زید مومن ہوگا۔ اور ابولہب کافر ہوگا اور چنانچہ جب یہ دونوں پیدا ہوئے تو زید مومن ہوا، ور ابولہب کافر رہا۔ پس خدا بعد الوقوع اس کے بھی اسیطرح سے ایک کو مومن اور ایک کو کافر بلا تغیر و تبدل کے جانتا ہی کیونکہ اگر تغیر ہوا تو علوم نہیں کہ علم میں۔ ذیل کی مثال سے یہ مضمون یوں ذہن نشین ہو سکتا ہی کہ مثلاً کسی دیوار سے ایک شفاف اور چمکدار آئینہ لگا دو اور اسکو کسی قسم کی حرکت مت دو۔ اب زید اگر بلباس سفید اس کے

مقابل آیا تو آئینہ میں زید بلباس سفید نظر آتا ہے۔ پھر عمر بلباس سُرخ اس کے سامنے آیا تو عمر بلباس سُرخ اسمیں نمایاں ہوا لیکن کیا کوئی عاقل کہہ سکتا ہے کہ آئینہ کی ذات بدل گئی یا اسکی صفت میں تغیر آیا۔ یا اس کی جہت بدل گئی۔ یا اس کی چمک میں کچھ کمی یا زیادتی ہو گئی۔ یہ سب کچھ نہ ہوا بلکہ صرف معلومات اور نقوشات خارجیہ میں تغیر ہوا اسی طرح سے معلومات کے تغیر و تبدل سے علم الٰہی میں کوئی تبدیلی یا زیادتی نہیں ہوتی ہے اب سوال یہ ہے کہ جب خدا سب کچھ جانتا ہے تو پھر جانچنے کی ضرورت کیا تھی۔ جواب اسکا یہ ہے کہ اگر خداوند عالم محض اپنے علم کے بنا پر لوگوں کو جزا یا سزا دیدیتا اور انسان کو موقع اظہار عمل کا نہ دیتا تو یہ انصاف کے خلاف تھا اور مجرم یہ کہہ سکتا تھا کہ ہم نے جرم کیا کیا ہے کہ جس کی سزا بھگت رہے ہیں، ناکردہ گناہ کی سزا اس کے رحم و حلم سے سراسر بعید تھا۔ بلکہ اس بنا پر تو دنیا کو پیدا کرنے کی بھی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ اور یہ کارخانہ عبث اور لغو ہو جاتا ہے۔ مگر چونکہ اوسکو یہ منظور تھا کہ وہ انسان کو دنیا میں صاحب عقل و اختیار بنا کر بھیجے اور انسان اپنے ارادہ اور خواہش سے جو کام کرے وہی مدار جزا و سزا ٹھہرے۔ اسی واسطے انسان کو عقل و تمیز کافی دیدی گئی ہے کہ جس کے ذریعہ سے وہ اچھے اور بُرے کاموں کو تمیز کر سکتا ہے اور اپنے حقیقی خالق کو پہچان سکتا ہے اسی لئے انسان ایمان بالغیب کا مکلف ہے اور ہماری آسانی کے لئے مزید لطف خدا کا یہ ہوا کہ اپنی خوشنودی کے کاموں کو بذریعہ انبیاء و رسل کے اس نے ہمیں بتا بھی دیئے۔ اب اتنے سامان اور اسقدر عنایت کے بعد بھی جس نے بُرائی کی وہ مستحق سزا ہے۔ پھر بُرائیاں بھی مختلف درجہ کی ہیں کسی کی سزا جہنم ابدی جیسے کفر و شرک اور کسی کو وہ بغیر سزا کے معاف کر دیتا ہے اور کوئی بعد کسی قدر سزا کے معاف ہونیوالی ہے۔ اور کوئی فقط توبہ سے معاف

ہوجاتی ہی۔ اور کسی کے حق میں تو بہ بھی مفید نہیں ہے۔ جیسے حقوق العباد جس کا درجہ تو شرک کے بعد ہی۔ مگر اور جرائم سے اوپر ہے۔ الغرض اسی عقل وہوش کے سبب آدمی جوابدہ ہی۔ اور جس مخلوق کو یہ سامان نہیں ملا جیسی بہائیم اس پر نہ جوابدہی ہے نہ سزا دائمی۔ بلکہ حضرت انسان میں سے بھی جب کسی سے عقل سلب کرلی جاتی ہی پس ابتدائے جنون سے وہ شخص مرفوع القلم ہوجاتا ہی کیونکہ خدا شناسی اور جوابدہی کا آلہ تو اب اس کے پاس رہا نہیں۔ ع

آنرا کہ عقل بیش غم روزگار بیش

اسجگہ پر میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ آریوں کے اس اعتراض کا جواب بھی عرض کردوں۔ جو یہ سب ختم اللہ علیٰ قلوبہم پر پیش کیا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا خدا ایسا ظالم ہی کہ اس نے کفار کے دلوں پر تو خود مہر لگادی ہے اور پھر بندہ کو ملزم بناتا ہی جسکا جواب قرآن پاک کی چند آیتوں میں نہایت خوبی کے ساتھ موجود ہی۔ منجملہ اس کے ایک آیت یہ ہے کہ فطرت اللہ اللتی فطر الناس علیہا۔ یعنی خدا نے ہر شخص کو ایک فطرت پر پیدا کیا۔ اور معرفت خالق کی عقل سب کو دیکر ہر شخص کو ایمان بالغیب کا مکلف بنادیا۔ اور پھر اپنا یہہ اصول سُنادیا کہ لیس للانسان اِلّا ما سعیٰ کہ جو کچھ انسان اپنی کوشش سے کماویگا۔ انسان آخرت میں وہی پاویگا۔ پس فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر اب جس کا جی چاہے اپنے اختیار سے ایمان لاوے اور جس کا دل چاہے کفر کرے پھر یہ بھی بتادیا کہ لن تجد لسنت اللہ تبدیلا کہ میں اپنی عادت کو بدلتا نہیں ہوں۔ یعنی گرچہ میں اس امر پر قادر ہوں کہ ہر شخص کو زبردستی مومن بناؤں۔ لیکن میں نے ایمان میں یہ اصول مقرر کردیا ہی کہ بندہ مختار ہی۔ خواہ اپنی عقل کو ایمان میں صرف کرے خواہ کفر میں

مختصر یہ کہ بعض انسان مومن ہو گئے۔ پس انمیں ایمان کی علامت لگا دیگئی۔
کما قال سیما ھم فی وجوھھم من اثر السجود۔ اور بدکاروں کے
واسطے یہ اصول مقرر ہوا کہ جو بدکار ہو اس کے قلب پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہی
جسے دیکھکر فرشتے اسکو پہچان جاتے ہیں کہ یہ برا آدمی ہی۔ الغرض جیسے تھوڑا
تھوڑا گناہ بڑھتا گیا۔ اسی طرح سے تھوڑی تھوڑی سیاہی بھی بڑھتی گئی یہاں
تک کہ اس نے پورے قلب کو گھیر لیا۔ جس کو خدا نے یوں بتلایا ہی کہ کلا بل
ران علیٰ قلوبھم ما کانو یکسبون۔ اب خدا نے مجرم و کافر کے قلب پر
کفر و بدکاری کی مہر لگا دی ختم اللہ علیٰ قلوبھم الخ

دوستو! اسکا مطلب یہ نہیں ہی کہ خدا نے زبردستی کسی کے دل
پر مہر لگا دی ہی۔ ایسا سمجھنا سخت غلطی ہی۔ بلکہ جو مستحق جس مہر کا تھا اسکو
وہ مہر لگا دی گئی۔

اسکی مثال یوں سمجھو کہ گورنمنٹ کی رعایا میں سب قسم کے لوگ ہیں کچھ بی
کلاس کے بدمعاش بھی ہیں کہ جن کے ساتھ گورنمنٹ نے کچھ علامت لگا دی
ہے کہ جب کوئی ملازم محکمہ پولیس کا آیا اُسی کو پکڑتا ہی۔ اور اسی کو بدمعاش
سمجھتا ہی۔ تو کیا یہ گورنمنٹ کا ظلم ہی کہ خواہ مخواہ اس نے بی کلاس بنا دیا۔ ہرگز
نہیں اسکی نگاہ تو ہر رعیت پر یکساں ہی۔ مگر رعیت کے بعض آدمی جب خود
سے بی کلاس کے بدمعاش بنگئے تو گورنمنٹ نے مطابق اپنے قانون کے بی
کے بی کلاس کی مہر ان بدمعاشوں پر لگا دی تاکہ اچھے اور برے کی تمیز
ہوتی رہی۔ اسی طرح سے جب لوگ کافر بنگئے تو خدا نے قلوب پر کفار کے کفر
کی مُہر لگا دی۔ ہرگز خدا نے زبردستی نہیں کیا ہی۔ کما قال تعالیٰ بل
طبع اللہ علیھا بکفرھم۔ تاکہ فرشتہ ایماندار اور بے ایمان کو پہچانا کریں

کچھہ خدا لے زبردستی نہیں کی ایمان وکفر میں زبردستی کا اصول۔ خدا نے رکھا نہیں ہے کما قال تعالےٰ لو شاء ربك لجعل الناس امة واحدة ولا یزالون مختلفین اگر وہ زبردستی کرتا یا ہر کافر کو دنیا میں فوراً سزا دیدیا کرتا تو پھر کوئی کافر رہ سکتا تھا ہرگز نہیں۔ مگر جب ایسا ہوتا تو وہ ایمان اضطراری کہلاتا جو ایمان بالغیب کا ضد ہی اور غیر مفید اور پھر مطیع و عاصی کی کوئی تمیز بھی باقی نہ رہتی۔ جیسے گورنمنٹ نے قانون بنا دیا ہی کہ جو وقت پر مالگذاری نہ دے اسکی جائیداد کو نیلام کر دیتی ہی اس ڈر سے نادہند آدمی بھی وقت مقررہ پر خزانہ ضرور ادا کر دیتا ہی۔ مگر مخلص اور مکارہ کی تمیز نہیں ہوتی ہی اور مشیت الٰہی نے یہ اصول مقرر کیا ہی کہ لوگ اپنے ارادہ اور خواہش سے ایمان بالغیب لاویں تاکہ جنت کسی قابل قدر فعل کی اجرت و انعام ہو۔ چونکہ آریہ کو قرآن سے ایک خاص عداوت ہی اور اس پر علم عربی سے بے بہرگی۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے تمام اعتراضات کی بنیاد ہٹ دھرمی یا ناسمجھی پر ہوتی ہی۔ اب دیکھو کہ ختم اللہ میں کیا پیچیدگی ہی کچھہ بھی نہیں۔ لیکن یہ سب جاہلوں کو بہکانا کرتے ہیں۔ واقفان فن کے سامنے تو کچھہ نہیں چلتی۔ ع

لولا الحمقاء لخربت الدنیا

قال عز اسمہ لیذهب عنکم الرجس اهل البیت ویطهرکم تطهیرا (سورہ احزاب) ابتداء سے سیاق کلام اس مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عورتوں کی طرف ہی لیکن خاص اس آیت تطہیر میں صیغہ مذکر کا لایا گیا ہی۔ جو چونکہ مسلمانوں میں متعلق اس امر کے بہت اختلاف ہے کہ مصداق اس آیت تطہیر کا کون ہی اور بعضوں سے تو ایسی غلطی ہوئی ہے کہ ازواج مطہرات کو تو اس حکم میں وہ ہرگز شامل نہیں سمجھتے ہیں حالانکہ امہات

المؤمنین کی شہرت ازواج مطہرات کے لفظ سے خود ایک بیّن دلیل انکے شمول کی ہے
بہرکیف محققین اہلسنت کا مسلک یہ ہے کہ اگر صرف ضمیر مذکر کا خیال کیا جاوے
اور سیاق وسباق سے قطع نظر کر لیا جاوے۔ تب تو آیت تطہیر کا وجود بہت محدود
اور مختصر رہ جاتا ہے کیونکہ اس لحاظ سے تو جنابہ سیدہ کا شمول بھی اسمیں نہیں
ہو سکتا ہے۔ لہذا مصداق آیت تطہیر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج
اور جنابہ سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بلکہ نبی کریم روحی فداہ کی
جمیع اولاد اور سیدنا حسنین علیہما السلام اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ گرچہ
کیاق آیت قبل سے روئے سخن عورتوں کی طرف تھا۔ اور مابعد میں بھی مخاطب
عورتیں ہیں۔ مگر چونکہ عند اللہ رجال اہلبیت بھی حکم تطہیر میں داخل تھے۔ لہذا
خاصکر اس آیت میں صیغہ مذکر کا استعمال ہوا۔ تاکہ کسی کو ایسا وہم نہو کہ حکم
تطہیر میں رجال اہلبیت داخل نہیں ہیں۔

قال عز اسمہ ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن ختم نبوت (۱)
رسول اللہ وخاتم النبیین۔ (سورۂ احزاب) چونکہ ادیان سابقہ
ایک محدود جماعت اور معین زمانہ تک کیواسطے ہوا کرتے تھے اس لیئے انبیاء
سابقین میں سے کسی نے اپنے واسطے ختم نبوت کا دعوی نہیں کیا اور جناب
محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین تمام دنیا کے واسطے اور قیامت
تک کے لیئے۔ لہذا اس سید المرسلین صلعم نے دعوئے نبوت کے ساتھ دعوی
خاتمیت بھی کیا اور لانبی بعدی فرمایا۔ کہ میں آخر الانبیاء ہوں۔ اب میرے
بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ آئندہ جو کوئی دعوی نبوت کریگا وہ مکار اور جھوٹا ہے
بلکہ ہر ملک کے باشندوں کو قیامت تک میرا دین کافی ہے اور اسی مذہب
کی پیروی میں سبکی فلاح اور نجات ہے۔ کما قال تعالی وما ارسلناک

الا کافۃ للناس بشیراً و نذیراً ولکنّ اکثر الناس لا یعلمون

اب یہاں پر مخالفین اسلام یوں کہا کرتے ہیں کہ چونکہ قرآن زبان عربی میں ہے
لہذا اگر واجب العمل ہے تو صرف قبیلہ عرب کے لیئے نہ کہ سارے جہان کیلیئے
اسکا جواب یہ کہ فرمان شاہی تمام رعایا پر واجب العمل ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم
ہے کہ رعیت کے آدمی مختلف زبانوں کے بولنے والے ہوتے ہیں ہر علاقہ میں
شاہی زبان جاری نہیں ہوتی ہے لیکن پھر بھی عمل کرلیتے ہیں کوئی خرابی نہیں
واقع ہوتی ہے اس لیئے کہ دستور یہ ہے کہ بادشاہ لوگ جب اپنا حکم اپنی زبان میں
دیدیا تو پھر اہل زبان سلطنت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ جس سبیل سے مناسب جانیں
ہر صوبہ کی مروجہ زبان میں رعایا تک وہ حکم پہونچادیں اور افراد رعایا میں پڑھے
لکھوں کا یہ کام ہوتا ہے کہ ناواقفوں کو سمجھا دیا کریں پس اسی طرح سے قرآنمجید کا
نزول گرچہ عربی میں ہوا ہے لیکن خلفاء اور ائمہ اور علماء امت اور والیان ملک
ہر زمانہ میں مطابق اقتضاء وقت کے اسکی تبلیغ اور اشاعت کرتے آئے ہیں
اور مذہب اسلام کی کتابوں کا ترجمہ مختلف زبانوں میں موجود ہے اور انشاء اللہ
قیامت تک یہ کام ہوتا رہیگا۔ چنانچہ ان دنوں تو **اعلیحضرت حضور**
نظام بالقابہ والی ریاست حیدرآباد دکن خلد اللہ
ملکہٗ کی علم پرور ہمت کی برکت سے گلشن اسلام میں علمی اشجار حیرت
انگیز اور دلفریب شادابی دکھا رہے ہیں اور حضور کے سایہ عاطفت میں علماء
کاملین مذہب اسلام کی نایاب کتابوں کا نہایت مستعدی اور سرگرمی سے
اردو میں ترجمہ کر رہے ہیں جس سے آیندہ نسل والوں کے لیئے نہایت قیمتی
اور قابل قدر خزانہ انشاء اللہ بہت جلد جمع اور مہیا ہوجائیگا۔ اور **جنابہ**
بیگم صاحبہ والیہ ریاست بھوپال بھی اشاعت علوم دین

میں علمار وقت کی حوصلہ افزائی فرماتی ہیں پسچ ہی جس علم وفن کی پرورش کسی
حکومت کے آغوش میں ہوتی ہی وہ اسکا مصداق ہو جاتا ہی۔ ع

ان طفل یکشبہ رہ یکسالہ میرود !

اور ما سوا اس کے علمائے اسلام اور دردمندان قوم متفرق طور سے بھی اس دینی خدمت میں تمامی عالم میں مشغول ہیں پس ان صورتوں سے ہر ملک کے باشندوں تک قرآنمجید پہونچ گیا۔ اور سب نے اسکے احکام کو سمجھ لیا۔

تعداد ازواج النبی صلعم

قال عز اسمہ ما کان لکم ان تؤذوا رسول اللہ ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا ان ذلکم کان عند اللہ عظیما (سورہ احزاب)

یعنی اے لوگو تم کو زیبا نہیں ہی کہ تم رسول اللہ کو ایذا پہونچاؤ اور نہ بعد رسول اللہ کے کوئی شخص ازواج مطہرات سے نکاح کا ارادہ کرے۔ کیونکہ یہ اللہ کے نزدیک بڑا جرم ہی۔ بلکہ مومنوں پر لازم ہی کہ رسول اللہ کی محبت اپنی جان سے زیادہ رکھیں اور ازواج مطہرات کو ماں سمجھیں۔ کیونکہ باپ تو صرف مربی جسم ہی اور رسول کریم مربی روح۔ پس جب جسمانی مربی کی زوجہ مرد پر حرام ہوتی ہی۔ تو روحانی مربی کی ازواج بدرجہ اولی واجب الاحترام امہات ہیں۔ کما قال تعالی النبی اولی بالمومنین من انفسہم وازواجہ امہاتہم۔ اب ان دونوں آیتوں سے منکرین اسلام کے اس اعتراض کا جواب بھی نکل آتا ہی جو کہ یہ سب حسداً وعناداً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعداد ازواج پر کیا کرتے ہیں۔ تفصیل اسکی یہ ہی کہ شرائع سابقہ کے وقت سے برابر کثرت ازواج کا رواج چلا آتا تھا۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کے سو بیبیاں کرنیکا اعتراف اہل کتاب کو بھی ہی۔ اور بھی چند باتیں مروج تھیں مثلاً قمار بازی یا سود خواری یا شراب خواری وغیرہ۔ پس ان مروجات میں سے جو امور کہ عقلاً اور طبعاً مکروہ تھے۔ اس سے تو ہمارے نبی کریم علیہ التحیۃ

والتسلیم کو ہمیشہ سے نفرت تھی اور قبل نزول شریعت اسلامی کے بھی حضور نے ان لغویات سے اجتناب کیا ہی۔ رہا تعداد ازدواج تو چونکہ ایک تو یہ فعل اگلے انبیاء کا تھا اور دوسرے رواج الملک لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد نکاح کیے تھے۔ علاوہ بریں ہر نکاح میں آپکے بہت بڑی انسانی ہمدردی و اصلاح و تعلیم امت تھی جس کی تفصیل بڑی بڑی کتابوں میں موجود ہی۔ لیکن جبکہ اسلام نے اسکی تعداد کو محدود کر دیا اور آیت فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلٰث وربٰع۔ نازل ہوئی پس مسلمانوں نے اس پر عمل شروع کر دیا۔ اور زائد تعداد میں کمی کر دی۔ یا جنکو عدل پر قدرت نہ تھی۔ انھوں نے ایک ہی عورت پر اکتفا کیا۔ کیونکہ صحابہ کا یہ فعل اضرار بالغیر سے قطعاً خالی تھا۔ اور ان کے اس طرز عمل سے کسی انسان کو ایذارسانی کا احتمال نہیں تھا۔ اس لیے کہ اگر کسی مسلمان نے مثلاً چھ عورتوں میں سے چار کو رکھ لیا۔ اور دو کو طلاق دیدیا۔ اور ان مطلقہ عورتوں نے اگر نکاح کی ضرورت اپنے واسطے محسوس کیا تو کسی دوسرے مسلمان سے انھوں نے نکاح کر لیا۔ اب اگر حضور بھی اپنی چار سے زائد ازواج کو طلاق دیدیتے تو چونکہ ازواج مطہرات امہات المومنین ہیں۔ لہذا ان کا نکاح کسی سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اور وہ عورتیں معلقہ رہجاتیں جو کہ سراسر اضرار بالغیر تھا۔ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک رحمۃ للعالمین ہے آپ کا کوئی کام ایذارسان کیونکر ہو سکتا ہی۔ یہی وجہ حضور کو خصوصیت کے ساتھ نو بیبیوں کی ہی۔ جب کہ خود قرآن نے کہا ہی ازواجہ امہاتہم تو پھر اعتراض کی گنجائش کہاں ہی ؎

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد
عیب نماید ہنرش در نظر

اب رہا یہ سوال کہ مسلمانوں کو چار ازواج کی اجازت کیوں ہی تو مومنین کے ازواج کا جواب نہایت شافی و کثرت سے علماء اسلام کیطرف سے دیا جا چکا ہے

ضرورت اسکو لکھنے کی نہیں ہے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہر بناء ان خفتم ان لا تعدلو فواحدۃ کے ہر مسلم تعدد کا مجاز نہیں ہے۔

قال عز اسمہ انا عرضنا الامانتہ علی السمٰوات والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان ط

(سورۂ احزاب) یعنے تکلیفات شرعیہ کو آسمان اور زمین اور پہاڑ پر پیش کیا لیکن اُنھوں نے انکار کیا اور انسان نے اسکو اُٹھا لیا۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ جب کہ شیطان ایک حکم کے انکار سے ملعون ہوگیا تو یہ چیزیں بوجہ انکار بارامانت کے ملعون کیوں نہیں ہوئیں جسکا جواب یہ ہے کہ شیطان پر سجود علی سبیل الفرضیت تھا اور ان اشیاء پر بطور عرض کے اور شیطان کا انکار سرکشی اور عناد سے تھا اور ان اشیاء نے بوجہ اپنی عدم قابلیت برداشت و نباہ کے انکار کیا تھا جس پر خود لفظ اشفقن منھا دلالت کرتا ہے۔ لیکن انسان نے ایسی جوانمردی کی بات کو خدا کے فضل پر بھروسہ کرکے اُٹھا لیا۔ کیونکہ انسان خود اپنی کمزوری کو جانتا تھا مگر عقل نے اسکو یہ مشورہ دیا کہ خواجہ خود صفت بندہ پروری داند لہٰذا اس نے ایاک نعبد کا اقرار ایاک نستعین کہہ کر کیا۔ جس پر خدا نے من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ کا وعدہ کرکے مخلصوں کے قلب کو مضبوط کردیا۔

قال عز اسمہ وما انت بمسمع من فی القبور (سورۂ ناظر) ترجمہ اہل قبور کو ہم سنا نہیں سکتے ہیں اس آیت کا عدم سماع موتی کی دلیل ٹھہرانا غلطی ہے کیونکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کافر کا قلب مُردہ ہوتا ہے جسکی وجہ سے وہ سماع نافع پر قادر نہیں ہے۔ جیسے مردہ در گور کہ باوجودیکہ خوب سُنتا ہے مگر اس کو اس شنوائی سے کوئی نفع نہیں ہے۔ اور حدیثوں سے بھی ثابت ہے کہ مردہ جوتہ کی آواز بھی سُنتا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مقتولین

بدر کو مخاطب کر کے بہت کچھ جاد دلایا ہے۔ اور یہ فرمایا کہ تم لنے خدا کے وعدہ کو پایا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ حضور یہ کفار تو مردہ ہیں کیا سنتے ہیں۔ سرکار نے فرمایا کہ ہاں یہ سب سنتے ہیں۔ غایت مافی الباب سماع موتیٰ کا ثبوت بربنا رخبر احاد کے از قبیل ثبوت ما سکت عنہ القرآن ہے۔ نہ از قسم حکم خلاف نص۔ کیونکہ صراحت نص سے اموات کے لیۓ مطلق سماع کا نہ ثبوت نکلتا ہی نہ انکار بلکہ بطور اشارۃ النص کے اموات کیواسطے آیت سے سماع غیر نافع کا ثبوت البتہ پایا جاتا ہے اور علما رمحققین کا مذہب مختار یہی ہے۔ چنانچہ اسی لحاظ سے خدا لنے سورہ نمل میں اُن کفاروں کو بھی مردہ کہا ہے۔ جو کہ نزول قرآن کے وقت زندہ اور موجود تھے! ور ان کو قرآن سُنایا جاتا تھا۔ لیکن چونکہ قرآن کو سنکر وہ کفار نفع نہیں حاصل کرتے تھے۔ لہذا باوجود بینا و زندہ ہونیکے وہ مردہ و نابینا قرار دیئے گئے ہیں۔ کما قال تعالیٰ انک لا تسمع الموتیٰ ولا تسمع الصم الدعاء اذا ولو مدبرین وما انت بہادی العمی عن ضلالتہم ان تسمع الا من یومن بایاتینا فہم مسلمون۔ جس کو اس مسئلہ میں مزید تحقیقات کی خواہش ہو وہ کتاب الروح مصنفہ علامہ ابن قیم کا مطالعہ کرے۔ اسمیں جواز سماع موتیٰ کے نقلی دلائل مصنفؒ نے بہت جمع کر دیئے گئے ہیں۔

قال عز اسمہ الا من خطف الخطفتہ فاتبعہ شہاب ثاقب (سورہ صافات) قبل بعثت حضور صلعم کے شیاطین فلک الدنیا تک جاکر فرشتوں کی باتیں سنتے تھے اور امور ماسیکون کے متعلق خبر بن کاہنوں سے کہہ دیا کرتے تھے۔ بعد بعثت کے بذریعہ شہاب کے آسمانی خبروں کے سرقہ سے انکو روکا جاتا ہے۔ یہاں پر منکرین نے دو سوال کیے ہیں ایک یہ کہ اگر ان ستاروں سے شیطان کو مارا جاتا تو ابتک ان ستاروں میں کمی ہو جاتی۔ دوسرا یہ کہ شیطان تو

خود ناری ہی اس کو آگ سے تکلیف کیا ہوگی۔ پہلے شبھہ کا جواب یہ ہی کہ جو کواکب کے مرکوزہ فی السماء ہیں۔ وہ تو قبل قیامت کے تغیر و فساد کو قبول نہیں کریں گے۔ دوسرے قسم کے کواکب غیر مرکوزہ سے شیطان کو مارا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ لقد زینا السماء الدنیا بمصابیح وجعلنا ھا رجوما للشیاطین سے تو یہ معلوم ہوتا ہی کہ جن کواکب سے آسمان کی زینت ہی انہی سے شیاطین رجم کیئے جاتے ہیں تو اسکا جواب یہ ہے کہ ممکن ہی کہ ان کواکب سی بطور شعلع اور ضوء کے کوئی شئے شہابی شکل بنکر شیاطین کو رجم کرتی ہو۔ اور پھر بھی کواکب میں نقصان لازم نہیں ہو۔ جیسے آفتاب کہ اپنی جگہ پر ہی لیکن پھر بھی شعاع شمسی سے یعنی شدت دھوپ میں لوگوں کو تکلیف ہوتی ہی۔ اور شیطان باوجودیکہ ناری ہی لیکن اسکو اس سے تکلیف ہو سکتی ہے۔ کیونکہ قوی ضعیف کو فنا کر دیتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی چراغ کو خوب دہکتے ہوئے آتشدان میں داخل کرنے سے تو وہ گل ہو جاتا ہی۔ اور شیطان کی آگ بہ نسبت آتش شہاب و دوزخ کے کمزور ہی علاوہ بریں یہ تو ایک معمولی تجربہ ہی کہ انسان خاکی کو خاک کے ڈھیلے سے ضرور تکلیف پہونچتی ہی۔ ہاں ایک شبھہ یہ بھی ہوتا ہی کہ کتب فلسفہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہاب کا ٹوٹنا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قبل بھی تھا پھر بعد البعثت اسکا وقوع کیونکر کہا جاتا ہے جسکا جواب خود حق تعالیٰ نے سورہ جن میں دیدیا ہی۔ انا لمسنا السماء فوجدنا ھا ملئت حرسا شدیدا وشھبا۔ پس ملئت حرسا شدیدا نے اس امر کو واضح کر دیا کہ گرچہ قبل بھی شیطان مرجوم ہوتا تھا۔ لیکن بعد بعثت سرکار کے خبر دل کی نگرانی بہت کیجاتی ہی اسی لیئے شہاب کی کثرت ہو گئی ہی۔ کیونکہ ان چوروں پر جیسی سختی اب ہے ویسی قبل نہ تھی۔

ح
D

قال عزاسمہ وظن داؤد انما فتنّاہ فاستغفر ربہ وخرّ راکعاً و
اناب (سورہ ص) یعنی حضرت داؤد کو جب اپنے فیصلہ کی غلطی معلوم
ہوگئی تو استغفار پڑھکر سجدہ میں گر گئے۔ اس آیت سے اسیقدر معلوم ہوتا ہے
کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو کوئی لغزش ہوئی تھی جس کے واسطے آپ نے
مغفرت چاہی تھی۔ اور عوام میں جو اوریا کی عورت والا قصہ حضرت داؤد ع کے
متعلق مشہور ہے۔ وہ سراسر غلط اور ناموضوع ہے اور انبیاء ورسل علیہم السلام
کا دامن ایسے لغویات سے پاک ہے۔ اس کے ناموضوع ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے
کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی اوریا کی عورت والا قصہ حضرت
داؤد ع کے متعلق بیان کریگا۔ میں اسکو سو سو کوڑا مارونگا۔ جو کہ دروغگو کی سزا ہے
درحقیقت ایسی رکیک اور دور از عقل باتوں کو ان حضرات کے طرف منسوب
کرنا نہایت بے ادبی ہے۔ اب محققین کے نزدیک وہ لغزش حضرت داؤد علیہ السلام
کی یہ ہے کہ آپ نے فقط مدعی کے بیان پر مدعا علیہ کو ظالم کہہ دیا تھا۔ قال لقد
ظلمک بسؤال نعجتک الی نعاجہ ط حالانکہ فریق ثانی کا بیان سنکر اور
شہادت لیکر فیصلہ کرنا لازم تھا۔ پس وہ لغزش داؤدی ہے کہ جس وجہ کر
اونکو نوبت توبہ اور استغفار کی آئی تھی۔

قال عزّ اسمہ اذ عرض علیہ بالعشی الصافنات الجیاد (سورہ ص)
یہ آیت حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ کے متعلق ہی لیکن جسطرح سے اور
انبیاء کے قصوں میں موضوعات کا خلط ملط بھی ہو گیا ہی اور بہت سی دور از
عقل باتیں خواہ مخواہ مشہور ہو گئیں ہیں جس کے واسطے محققین کو بڑی محنت
اور سقم کے امتیاز میں کرنی پڑی ہے، وہی حال اسکا بھی ہی چنانچہ امام فخر الدین
رازی نے اسکو ذکر کر کے اس کے قبائح پر تفصیلی بحث کی ہی اور اسکا صحیح اور
قریں عقل قصہ یوں لکھا ہی کہ جس طرح سے شریعت محمدی میں گھوڑا رکھنا بغرض
جہاد کے کار ثواب ہی اسی طرح سے ان کے زمانہ میں بھی تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ
جب آپکو لشکر روانہ کرنیکی ضرورت پیش آئی، تو اس نے دارونہ اصطبل سے اور
باقی سواروں سے یہ فرمایا کہ سب گھوڑوں کو میرے سامنے لاکر دوڑاؤ۔ تاکہ سب
کا امتحان ہو جائے کہ کون کون اسوقت سفر کے واسطے زیادہ مناسب ہوگا۔ چنانچہ
ایسا ہی کیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ گھوڑے نگاہ سے غائب ہو گئے حتی توارت
بالحجاب چونکہ آپ نے ان گھوڑوں کو بہت غور اور توجہ سے دیکھا تھا۔ لہذا بعد
غیبوبت ان کے پاس کے موجودہ آدمیوں سے یہ فرمایا کہ تم لوگ ایسا مت
خیال کرو کہ میں ان گھوڑوں کو اپنی ذات کے واسطے پیار کرتا ہوں۔ بلکہ میری محبت
ان سے صرف اسواسطے ہے کہ تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے دین کی خدمت
میں مجھکو آسانی ہو۔ جب وہ سب واپس آئے تو آپ نے فرمایا کہ ردوھا علی
یعنی ان گھوڑوں کو میرے سامنے لاؤ۔ جب وہ قریب لائے گئے تو اس نے ہر
ایک کی گردن اور قدم کو ٹٹولنا شروع کیا۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ سب تندرست ١
ہے یا کہ اسمیں کوئی بیمار تو نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کو گھوڑے کے علاج اور شناخت ٥
میں نہایت کامل ملکہ حاصل تھا جس کو قرآن نے فطفق مسحا بالسوق والاعناق

کہاہے۔

قال عز اسمہ رب اغفرلی وھب لی ملکاً لا ینبغی لاحد من بعدی

(سورۂ ص) یعنی حضرت سلیمانؑ نے یہ دعا کی تھی کہ اے میرے رب میری خطا

معاف کر اور مجھ کو ایسی قدرت عطا کر جو کہ میرے بعد کسی کو نہ ہو۔ بس یہ دعا ان کی

مقبول ہوئی کہ انکو ہوا پر قدرت و اختیار دیا گیا۔ ملک سے ملک دنیا مراد نہیں ہے

کیونکہ دولت دنیاوی کی قدر تو نبیوں کے دلوں میں مطلق نہیں ہے اور پھر خود غرضی

تو ان کی شان سے بعید مگر بعض مفسرین نے ملک سے دولت دنیا مراد لیا ہے اور

اسی کو دوسرے طور سے مرجح بناتے ہیں جسکو بڑی بڑی کتابوں میں دیکھو۔

قال عز اسمہ ربنا امتنا اثنتین واحییتنا اثنتین فاعترفنا

بذنوبنا فھل الی خروج من سبیل (سورہ مومن) ترجمہ اے خدا تو نے

مجھ کو دو مرتبہ مارا اور دو مرتبہ زندہ کیا پس اقرار کیا میں نے اپنی لگا ہوں کا۔

کیا اب جہنم سے نکلنے کی کوئی سبیل ہے۔ اس آیت سے دو موت اور دو حیات

کا ثبوت ملتا ہے۔ دو مرتبہ جان بخشی کو تب سب جانتے ہیں۔ ایک مرتبہ شکم

مادر سے دنیا میں آنا۔ اور دوسری مرتبہ بطن قبر سے زندہ ہو کر میدان محشر

میں جانا۔ لیکن مرنا تو بظاہر ایک مرتبہ ہوتا ہے۔ تو پھر دو موت کیونکر ہے اس کی

تحقیق میں ہم کو قرآن ہی کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ بقول مولانا معنی قرآن

از قرآں بجو، اب قرآن سے اس امر کا پتہ ملتا ہے کہ موت کے دو معنی ہیں۔

ایک عدم الحیات یعنی اسی حیات حسّی کے قبل والی حالت کو بھی قرآن نے

موت ہی کہا ہے۔ چنانچہ کیف تکفرون باللہ وکنتم امواتاً فاحیاکم

ثم یمیتکم ثم یحییکم ثم الیہ ترجعون۔ اس پر شاہد ہے۔ پس اس

لحاظ سے ہر انسان کی قبل از تخلیق والی حالت ایک موت ہوئی۔ اور دوسری

اثبات دو موت و دو حیات

حقیقی موت یعنی بمعنی سلب الحیوٰۃ کے جس کو کہ موت حِسّی اور دنیاوی موت کہتے
ہیں پس اس اعتبار سے دو موت اور دو حیات ثابت ہے۔ اب یہاں پر ایک
اعتراض یہ ہوتا ہے کہ عہد الست میں خدا نے سب سے اپنے ربوبیت کا اقرار
لیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اقرار بدون تعلق حیات کے نہیں تھا۔ لہٰذا اس بنا پر
زندگی چار مرتبہ ہو جاتی ہے اور موت بھی چار ثابت ہوتی ہے ایک زندگی عہد
الست کی دوسری زندگی دنیاوی تیسری زندگی قبر کی بوقت سوال نکیرین کے
چوتھی زندگی حشر کی اور علیٰ ہذا القیاس آیا۔ موت زمانہ کنت کنزاً کا
یعنی عہد الست سے قبل کی جو حالت تھی دوسری موت قالوا بلیٰ کے بعد
سے تا ظہور فی الدنیا تیسری موت دنیاوی یعنی مشہور موت چوتھی موت
بعد سوال نکیرین کے۔ چونکہ عہد الست کا ثبوت تو بالاتفاق قرآن سے ہے اور
محققین کے نزدیک حیات القبر بھی قرآن ہی سے ثابت ہے۔ لہٰذا اسکا اقرار
کرتے ہوئے پھر بھی دو موت اور دو حیات کا ثبوت دشوار ہی رہا اور آیت ما نحن
فیہ میں دو موت اور دو حیات کا تذکرہ کیوں کیا گیا ہے ت **جواب** اسکا یہ ہے
کہ قرآن پاک میں لفظ اور غور کرنے سے تو بیشک موت اور حیات کی تعداد دو سے
زیادہ معلوم ہوتی ہے لیکن چونکہ عہد الست کی زندگی اور قبر کی حیات محض
قلیل وقت کی تھی۔ لہٰذا اسکا ذکر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ عہد الست گویا مقدمہ تھا
حیات دنیاوی کا اور مقصود بالذات اس زندگی کی حیات تھی اور حیات القبر
بمنزلہ تکملہ حیات دنیاوی ہے۔ پس بالیں لحاظ انھوں کے دو کہا گیا۔ یعنی ایک موت
بمعنی عدم الحیات یعنی حالت قبل تخلیق کے اور دوسری موت بمعنی سلب الحیوٰۃ
یعنی موت حِسّی لے لی گئی اور ایک حیات دنیاوی اور دوسری زندگی حشر کی
اب اگر کوئی یہ کہے کہ اچھا ہمنے مانا کہ دونوں معنے کا لحاظ کر کے اس طرح سے تمنے

دو موت ثابت کردیا۔ اور صرف حیات طویلہ کا اعتبار کرکے تمنے دو حیات بھی منوا لیا

لیکن سورہ صافات میں خدا نے اہل جنت کا یہ قول نقل کیا ہے کہ افما

نحن بمیتین الا موتتنا الاولی وما نحن بمعذبین ان ھذا لھو

الفوز العظیم یعنے اب ہم لوگ نہیں مرینگے بس موت سے ایک مرتبہ

جو سرد کار ہوا سو ہوا الغرض اس آیت سے ایک موت کا ثبوت ملتا ہے۔ اور آیت

زیر بحث سے دو موت کا۔ لہذا ان دونوں آیتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

جواب اسکا یہ ہے کہ یہ تو اوپر ثابت کیا جاچکا ہے کہ موت کا دو فرد ہے ایک

ناقص اور مجازی یعنی حالت قبل تکوین کی۔ اور دوسرا کامل اور حقیقی بمعنی سلب

الحیوٰۃ جس کو کہ موت حسی اور دنیاوی کہتے ہیں۔ اور چونکہ انسان کی پہلی حالت

ایسی تھی کہ جسمیں راحت اور تکلیف کسی سے واسطہ نہیں تھا۔ اور دوزخ

میں کفاروں کو طرح طرح کے دکھ و عذاب سے جب سروکار پڑا تو وہ اپنی عدم

محض والی حالت کو بھی غنیمت جاننے لگے اور اسی کو یاد کرکے ربنا امتنا

اثنتین کہنے لگے۔ اور سورہ صافات میں چونکہ اہل جنت کا تذکرہ ہے اور

جنتی نہایت آرام وچین میں ہیں۔ پس باوجودیکہ اہل جنت کو بھی اس بات کا

علم ہے کہ عدم محض کا زمانہ بھی ضرور ہم سب پر گذر چکا ہے۔ مگر چونکہ اس میں

گرچہ کوئی تکلیف نہ تھی لیکن بوجہ عدم محض کی حالت ہونے کے کسی قسم کا احساس

آرام بھی نہیں تھا اس لیے اہل جنت نے اس ناقص اور مجازی موت کا ذکر نہیں

کیا۔ البتہ یہ موت دنیاوی چونکہ موت حقیقی ہے۔ اور ذریعہ دخول جنت بھی ہے

لہذا صرف اسی کا ذکر کیا۔ یہ توجیہ تو اس ترجمہ کے بنا پر ہے جس کو کہ ہمنے اوپر

نقل کیا ہے ورنہ افما نحن بمیتین الا موتتنا الاولی ما راقم الحروف

جو ترجمہ کرتا ہے اسمیں اس اعتراض کا ورود ہی نہیں ہوتا ہے۔ یعنی ہم لوگ

اب نہیں مرینگے پس دنیا میں جو موت آچکی سو آچکی لفظ اولی آخری کے
مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ خود قرآن میں ہے وللآخرۃ خیر لك
من الاولی یعنی اسے بھی البتہ آخرت آپ کے واسطے دنیا سے بہتر ہے اب
جنبتیوں نے اس آیت میں اس بات کی تقریر کی ہے کہ عالم آخرت میں موت واقع
نہ ہوگی۔ اور اس عالم کا نقیض جو عالم ہے جس کو عالم اولی سے تعبیر کیا جاتا ہے صرف
اسمیں وقوع موت کا اقرار کرتے ہیں۔ تعداد سے بحث نہیں کہ عالم اولی میں کتنے
قسم کی موت تھی اور کتنی بھی ایک یا دو یا تین یا چار۔ اسکا ذکر نہیں ہے نفس وقوع
موت یا لا وقوع موت سے بحث ہے اسی طرح سے سورہ دخان کی ایک آیت بھی
گویا اس دعوی کی تفسیر کر رہی ہے لا یذوقون فیہا الموت الا الموتۃ الا
ولی یعنی عالم آخرت میں موت کا ذائقہ نہیں چکھنا ہے پس دنیا میں موت کا
ذائقہ ہو چکا۔ یہاں بھی اولی بمعنی دنیا لیا گیا ہے اور اس کے مقابل والے عالم
میں وقوع موت کی نفی کی گئی ہے یعنی دنیاوی موت کے بعد اب موت نہ ہوگی
الغرض دونوں میں کسی طرح کا اختلاف اور تعارض نہیں ہے۔ اب اگر کوئی یہ
کہے کہ یہ تو ہمنے تسلیم کیا کہ موت کے دو معنی ہیں۔ لیکن آیت زیر بحث میں تو
لفظ امتنا اثنتین ہے جسکا مصدر اماتت ہے اور اماتت مخصوص ہے موت
حقیقی یعنی سلب الحیوۃ کے لئے جسکا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ مار ڈالنا ایسی شئے کو
جس کو قبل حیات حاصل تھی۔ لہذا اسی معنی کے بنا پر دو موت کا ثبوت پھر بھی
دشوار ہے۔ **جواب** اسکا یہ ہے کہ جسطرح سے موت کے حقیقی اور عرفی
معنی یہ ہیں کہ مار ڈالنا ایسی شئے کو جس کو کہ قبل حیات حاصل تھی اسی
طرح سے احیاء کے بھی عرفی معنی یہ ہیں کہ زندہ کرنا اس شئے کو کہ جس سے
کہ حیات منقطع ہوگئی ہے۔ چنانچہ لیتے ہیں کہ عیسی علیہ السلام مردیکو زندہ

زندہ کرتے تھے۔ اور جو کوئی شخص کہ شکم مادر سے پیدا ہوتا ہے اسکو عرف عام میں زندہ ہونا یا جلانا نہیں بولتے ہیں۔ بلکہ پیدا ہونا کہتے ہیں یعنی ایجاد کے معنی ایسی لیتے ہیں۔ لہذا آیت ما نحن فیہ میں اگر موت کو بمعنی عرفی لیں گے تو اس آیت میں حیات کو بھی بمعنی عرفی لینا ہوگا اب بلحاظ دونوں جگہ معنی عرفی مراد لینے کے بھی مدعا ثابت ہے یعنی ایک موت دنیاوی یعنی ایک جاندار کی جان نکال لی گئی اور دوسری موت قبر میں اس طرح پر کہ وہاں بھی چند لمحہ کی زندگی بغرض سوال وجواب نکیرین کے جس شخص کو عطا ہوئی تھی اس جاندار کی جان پھر نکالی گئی اور اسی طرح سے دو زندگی کا ثبوت لو ایک احیاء فی القبر یعنی قبر میں اس مردہ کو بغرض سوال نکیرین کے جان عطا کی گئی جس کو کہ دنیا میں حیات حاصل تھی اور دوسری زندگی آخرت کی یعنی نفخ ثانیہ کے بعد ع۵ پھر اس مردے کو جان دیگئی جس کو کسی وقت حیات حاصل تھی گویا وہ سلب شدہ حیات پھر عطا ہوئی الغرض جس اعتبار سے دیکھا جاوے ایک مدعا دونوں سے ثابت ہوتا ہے۔ اور کوئی تعارض نہیں ہے۔ مافہم واللہ ہو الموفق للصواب۔

ع۵ یعنی قیامت میں ہر مردہ اپنے خاص قالب دنیاوی کے اعادہ کے ساتھ زندہ کیا جائیگا بجز پیدائش عرفی دنیاوی کے کوئی زندگی خواہ وہ حیات القبر ہو خواہ حیات اخروی ہرگز ہرگز بصورت تناسخ یا توالد وارد نہیں ہوگی اور نہ کسی کو اس دار عمل میں کوئی زندگی دوبارہ ملیگی الغرض ہر لحاظ سے مطلب ثابت ہے۔

قال عز اسمہ فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین (سورہ دخان) اس آیت کے متعلق تفسیر میں عجیب عجیب بحث ہے عام فہم مطلب یہ ہے جسکو کہ حضرت حذیفہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے یعنی علامات قیامت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک دھواں نمودار ہوگا۔ جو مشرق سے مغرب تک احاطہ کرلیگا۔ اور مدت اسکی چالیس روز ہوگی مومنوں کو اس سے صرف زکامی کیفیت ہو جائیگی۔ اور کفار کی حالت نشیلی ہو جائیگی اور وہ دھواں کفار کے ناک و کان و مقعد تک میں نفوذ کر جائیگا۔

قال عز اسمہ قالوا یا قومنا انا سمعنا کتابا انزل من بعد موسیٰ

مصدقا لما بین یدیہ یھدی الی الحق والی صراط مستقیم
(سورہ احقاف) یعنی جنّاتوں نے اپنی قوم سے یہ کہا کہ ہمنے آج ایک ایسی
کتاب سُنی ہے۔ جو کہ حضرت موسیٰ کے بعد نازل ہوئی ہے اور وہ کتاب صراط مستقیم
کی ہدایت کرتی ہے۔ اب یہاں پر سوال یہ ہوتا ہے کہ نزول قرآن تو بعد حضرت عیسیٰ
علیہ السلام کے ہے نہ کہ بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے۔ پھر اللہ نے حضرت مسیح
کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ گرچہ مفسرین نے اسکی تاویل کئی طرح سے بیان کی ہے لیکن
اس جگہ پر میں شیخ محی الدین اکبر کا قول نقل کرتا ہوں وہ لکھتے ہیں کہ چونکہ دیگر انبیاء
علیہم السلام اپنا اپنا کام پورا کرکے تشریف لے گئے جبکا سلسلہ قرآن سے قبل
حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے۔ اور اگرچہ حضرت مسیح بھی جلیل القدر اور
صاحب کتاب رسول ہیں اور انکا زمانہ بھی نزول قرآن سے قبل ہے۔ مگر حضرت
مسیح علیہ السلام کے ہیکل نورانی کا ظہور ابھی نہیں ہوا ہی اور تمامی امور مفوضہ
الیہ کا تکمیل بھی ابھی نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ ایک ضروری کام متعلق آپ کے
قتل دجّال ہے جو باقی رہے اسی واسطے آپ چوتھے آسمان پر زندہ اُٹھا لیئے
گئے ہیں۔ اور پھر دوبارہ دنیا میں تشریف لاکر اس کام کو پورا کرینگے! اسی وجہ
سے حضرت مسیح کا ذکر نہیں کیا گیا۔ بلکہ انزل من بعد موسیٰ کہا گیا حضرت
اسی قول کو نقل کرنے کی وجہ ہے تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جاوے کہ مثل جمہور
اہل حق کے شیخ بھی رفع مسیح بجدہ نزول مسیح بجدہ کے معتقد تھے چنانچہ اپنی
تصنیفات میں مختلف مواقع پر شیخ اکبر رح نے اپنے اس عقیدہ کا تذکرہ کیا ہے
پھر جماعت باطلہ کا یہ کہنا کہ شیخ اکبر نزول مسیح کے قائل نہ تھے یہ شیخ پر سراسر
افترا ہے نادک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں + تڑپے ہے مرغ قبلہ نما
آشیانہ میں۔

قال عز اسمہ والنجم والشجر یسجدان (سورہ رحمان) نجم ستارہ کو بھی کہتے ہیں۔ اور بیلدار نبات کو بھی جیسے کدو وغیرہ کی بیل۔ اب نجم کو اگر بمعنی کواکب کے لیں تب تو سجود اسکا باعتبار غروب کے ہے۔ چنانچہ نیر اعظم کو تو روزانہ ہر شخص جھکتا ہوا دیکھتا ہے۔ اور اگر نجم بمعنی بیلدار ہے۔ تب بھی مدعا ثابت ہی۔ یعنی اب ترجمہ آیت کا یہ ہوا کہ بیلدار نبات اور تنہ والا درخت خدا کو سجدہ کرتا ہی۔ سنو سجدہ کے معنی ہیں جبیں بر زمیں نہادن۔ لہذا اشجار اور نبات سے ہر وقت صدور سجدہ کا ہوتا ہے کیونکہ جس طرح سے سر کٹ جانے سے حیوانات کی زندگی محال ہو جاتی ہے اسی طرح سے نباتات کی زندگی بھی جڑ کے کٹ جانے سے باقی نہیں رہتی ہے۔ اور دیکھو حیوانات میں غذا کھانے کا عضو سر ہی کے طرف ہوتا ہی۔ اسی طرح سے درختوں میں بھی حصول غذا یعنی جذب رطوبت ارضی جڑ ہی سے متعلق ہے۔ لہذا جس کو عرف عام میں جڑ کہتے ہیں۔ درحقیقت یہ انکے واسطے بمنزلہ سر ہے۔ اور یہ تو معلوم ہے کہ جڑ ان کی ہمیشہ زمین میں رہتی ہے۔ پس نجم وشجر کا مدام سربسجود ہونا ثابت ہو گیا واضح ہو کہ بادی النظر میں غذا کھانے والی مخلوق تین ہی۔ نباتات، حیوانات، انسان۔ جسمیں سب سے اشرف المخلوقات حضرت انسان ہیں، اور اسی لیے انکو حصول غذا میں کسب امتیاز بھی دیا گیا جسو جہکر یہ خدا کی دی ہوئی عقل کے مدد سے مطابق اپنی خواہش کے طرح طرح کی غذائیں ایجاد اور اختراع کیا کرتا ہے۔ اور اپنے دونوں ماتحتوں پر اسکا آزادانہ تصرف بھی رات دن جاری ہے۔

اور یہ خاص انسان کے اعزاز کا ہے کہ غذا کے سامنے اس کو سرنگوں نہیں ہونا پڑتا ہے۔ بلکہ سربلندی کے ساتھ یہ غذا کھاتا ہے۔ اور باوجود اسقدر شرافت کے رات دن میں صرف پانچ وقت اپنے قصد سے رازق حقیقی کا

سجدہ اس، صاحب عقل و اختیار مخلوق پر فرض ہوا۔ الغرض کام اتنا کم اور اسکی
اجرت ایسی بڑی کہ جنت ابدی۔ اب اس کے بعد شرافت میں درجہ حیوانات کا ہی
کیونکہ یہ حصول غذا میں اپنے نہ تو انسان کی طرح سے آزاد اور صاحب اختیار ہیں
اور نہ نباتات کی طرح سے بیدست و پا۔ چونکہ اسکی حالت بین بین کی ہی۔ لہذا
اکثر حیوانات کو غذا کھاتے وقت ہر ہر لقمہ کے لیئے سر کو زمین کے طرف جھکانا
پڑتا ہے۔ اور بغیر سرنگوں ہوئے۔ وہ اپنی اختیاری اور معمولی غذا حاصل نہیں
کر سکتے ہیں۔ جو درحقیقت روزی رسان تعالیٰ شانہ کو سجدہ کرتا ہے پھر اسکے
بعد نباتات کا درجہ ہے۔ کیونکہ یہ حیوانات کے طرح سے بھی چل پھر کر اپنی غذا کو
حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔ لہذا یہ ہر وقت رازق حقیقی کے سامنے سر بسجود رہتے
ہیں۔ جیسا کہ اوپر انکا سجدہ بتایا جا چکا ہے۔ لیکن ان دونوں کے اس کثرت سجود
کی اجرت کچھہ پائیدار نہیں ہے۔ اور انسان کے پنجگانہ کی بڑی مزدوری وجہ یہ ہے
کہ انسان کا فعل چونکہ اختیار اور عقل سے صادر ہوتا ہے۔ اور حیوانات کا بے عقلی سے
لیکن اگر اس عاقل اور اشرف مخلوق نے پنجوقتی میں غفلت کیا تو پھر کتنی سخت سزا
کا وہ مستحق ہے کہ محتاج بیان نہیں جبکہ ایک وقت کے تارک الصلوٰۃ کو حضور
سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کافر فرمایا یعنی من ترک صلوٰۃ متعمدا فقد
کفر۔ الحدیث تو وائے برحال اس شخص کے جو کہ عمداً ترک صلوٰۃ کا مرتکب ہو
بہرکیف نجم و شجر کا سجدہ ثابت ہو گیا اور اسی طرح سے اور مخلوقات کے مطابق حال
جیسا سجدہ ہے وہ ضرور بجا لاتے ہیں۔ کیونکہ سورہ صحیح میں ایک آیت ہی جس سے
ساجدین کا دائرہ بہت وسیع معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ نجم و شجر ہی تک محدود نہیں
ہے کما قال تعالیٰ الم تران اللہ یسجد لہ من فی السمٰوات و من
فی الارض والشمس والقمر والنجوم والجبال والشجر والدواب

وکثیرٌ من الناس ط وکثیرٌ حق علیہ العذاب ط

قال عزاسمہ المھیمن العزیز الجبار۔ (سورہ حشر) لفظ جبار اور قہار پر سماجیوں نے ایک ہنگامہ مچا رکھا ہے کہ مسلمانوں کا خدا بڑا قہار اور ظالم ہے اس لیئے میں ان دونوں دلکش اور پیارے لفظوں کے معنی بتا دیتا ہوں۔ جبّار کا مادہ جبر ہے اور جبر کے معنی ہیں ٹوٹے ہوئے کو جوڑنا اس لیئے زخم پر جو مرہم کی پٹی رکھی جاتی ہے اسکو اطبا جبیرہ کہتے ہیں الغرض جبر سے مبالغہ کا صیغہ جبار ہوا جسکا مطلب یہ ہوا کہ خدا ہر قسم کے شکستگی کو خوب درست کرتا ہے۔ بتایئے جس میں درماندوں کی اصلاح اور مجروحوں کے درستگی کی قوت نہ ہو بھلا وہ خدائی کیا کریگا اسی طرح سے قہار بھی مبالغہ کا صیغہ ہے جو قہر سے مشتق ہے اور قہر غلبہ کو کہتے ہیں۔ لہذا قہار کا ترجمہ یہ ہے کہ خدا وہ ذات ہے جو ہر قسم کے دشمنوں پر خوب غالب ہے۔ بتایئے جو اپنے دشمنوں سے ڈرتا پھرے اور مغلوب رہے وہ خدائی کیونکر کریگا۔ بلکہ خدا کو تو جبار اور قہار ہونا لازم ہے۔ ہٹ دھرمی بھی عجب بلا ہے کہ ایسے اچھے لفظوں کو سماجیوں نے کیسا خوفناک مشہور کر رکھا ہے۔

قال عزاسمہ اذ قال عیسیٰ بن مریم یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقاً لما بین یدی ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد (سورہ صف) انجیل یوحنا کے فصل ۱۶ میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے یہ کہا تھا۔ کہ میرا جانا تمھارے حق میں مفید ہے کیونکہ اگر میں نجاؤنگا تو فارقلیط نہیں آوینگے۔ لہذا میں آسمان پر جاتا ہوں اور فارقلیط (یعنی احمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لاوینگے اور وہی تم کو دین کی تعلیم دینگے اور حق و باطل کی تمیز بتاوینگے۔

قال عزاسمہ مثل الذین حملوا التوراۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار

یحمل اسفارا (سورہ جمعہ) ترجمہ: جنھوں نے توریت کو سیکھا لیکن اسپر عمل نہیں کیا۔ گویا وہ کتاب اُٹھانیوالا گدھا ہے۔ اسی طرح سے ہر عالم بے عمل مصداق اس قسم کا ہی۔ خلاصہ یہ کہ اس آیت سے اسبات کا پتہ ملتا ہی کہ عالم بے عمل کا برزخ حماری ہوجاتا ہی ~

چارپایہ بروکتابے چند + نہ محقق بود نہ دانشمند

چونکہ مسخ صورت اس اُمت کیواسطے نہیں ہی۔ لیکن قلوب مسخ ہوا کرتے ہیں پس یہی وجہ ہے کہ اولیاء اللہ کے نزدیک ہر عالم کی قدر نہیں ہوتی ہی۔ بلکہ بعض بعض سے اظہار نفرت بھی کیا جاتا ہی جسکا مولویوں کو رنج بھی ہوتا ہی کہ میری قدر نہیں کی گئی فلاں بزرگ کا اخلاق اچھا نہیں ہی۔ مگر دوستو اصل وجہ یہ ہے کہ بزرگان دین کے قلوب روشن ہوتے ہیں عالم بے عمل کے برزخ کا انپر انکشاف ہوجاتا ہے۔ لہذا عالم بے عمل اور بدکار کو نکال دیا جاتا ہے۔ کیونکہ زصحبت ناجنس عذاب بیت الیم۔ اور اہل عمل کی توقیر کی جاتی ہے۔ اور آنحضرت کا صاحب انکشاف ہونا تو ایک امر مسلمہ ہے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں ~ این طبیبان بدن دانشوند + بر سقام تو ز تو واقف ترند + ہم ز نبض و ہم ز رنگ و ہم ز دم + بو برند از تو بعد گونہ سقم + پس طبیبان آلہی در جہاں + چوں ندانند از تو اسرار نہاں + گاملان از دور نامت بشنوند + تا بقعر تار و پود ت در روند + بلکہ پیش از زادن تو سالہا + دیدہ باشندت بچندیں حالہا۔

قال عز اسمہ تبارک الذی بیدہ الملک وھو علی کل شیٔ قدیر ؕ الذی خلق الموت والحیٰوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا (سورہ ملک) مبارک ہی وہ ذات جو ہر شئے پر قادر ہی اور اُسی کے ید قدرت میں حکومت ہی اور اس نے موت و حیات کو اس لئے پیدا کیا ہی تاکہ اعمال صالحہ کا امتحان ہو جاوے۔ قبل اسکے سورہ مومن میں موت و حیات کی کافی بحث گذر چکی ہی۔

1/B

یہاں پر صرف یہ بتانا منظور ہے کہ جب خلق الموت کہا گیا تو معلوم ہوا کہ موت بھی کوئی صفت وجودی ہی۔ لہذا مجازی موت تو بمعنی عدم الحیوۃ کے ہے اور حقیقی موت بمعنی سلب الحیات کے اب حقیقی موت کا وجودی ہونا بعض روایات سے یوں معلوم ہوتا ہی کہ خدا نے موت کو بصورت دنبہ کے پیدا کیا ہے جب کوئی جاندار اسکی بو سونگھتا ہے۔ تو اس سے حیات علیحدہ ہو جاتی ہے نقلہ فخر الرازی عن الکلبی اور صحیحین کی اس حدیث سے بھی موت کا وجودی ہونا سمجھا جاتا ہے

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا
جاء اهل الجنة الجنة واهل النار النار جیئ بالموت ثم یجعل بین
الجنة والنار ثم یذبح ثم ینادی منادی یا اهل الجنة لا موت
ویا اهل النار لا موت فیزداد اهل الجنة فرحا الی فرحهم
ویزداد اهل النار حزنا الی حزنهم متفق علیه

لیبلوکم سے یہ معلوم ہوا کہ ایمان اور کفر اور فسق و تقوی کی استعداد قدیمی ہے کیونکہ امتحان کے بعد شئی مستور سب پر کھل جاتی ہے۔ جیسے سونے کو کسوٹی پہ لگانے سے اوسکا سونا ہونا معلوم ہو جاتا ہی اور دام دینے والے کو تردد نہیں باقی رہتا ہی کچھہ کسوٹی پر لگانے سے سونا تیار نہیں ہوتا ہی لیکن دستور بھی ہی کہ ترقی دینے کیوقت لڑکونکا امتحان لیا کرتے ہیں اور دام دینے کیوقت سونے کو جانچ لیتے ہیں۔ گرچہ تجربہ کار اُستاد اپنے تجربہ اور قیاس کے بنا پر قبل امتحان کے یہ جانتا ہی کہ فلاں فلاں پاس ہوگا اور فلاں ناکام رہیگا لیکن اگر محض اس تجربے کی بنا پر بغیر امتحان کے کسی کو ترقی دیدیں اور کسی کو نہیں، تو الزام بے انصافی کا ضرور عاید ہوگا۔ لہذا امتحان لینا ضرور ہوا پس اسی طرح سے خدا کے علم اور انسان کے عمل کو سمجھو لیکن یہاں پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اُستاد کا قیاس تو پھر بھی کچھہ گنجایش غلطی کی رکھتا ہی کیونکہ نتیجہ اس کے نزدیک یقینی تو ہوتا نہیں ہی۔ اگر ہوتا ہے تو مشکوک لیکن خدا

بندونکو کیوں جانچتا ہے۔ یا تو نتیجہ کو وہ بالتفصیل جانتا تھا یا نہیں۔ اگر وہ جانتا تھا تب تو تحصیل حاصل لازم آتا ہے۔ اگر نہیں جانتا تھا۔ تب الزام جہل لازم آتا ہے اور یہ دونوں ممنوع ہے۔ **جواب** اسکا اگرچہ اوپر کی عبارت میں یعنی لقد فتنا الذین من قبلھم کی بحث میں نہایت واضح طور سے مذکور ہو چکا ہے۔ مگر پھر بھی ناظرین کے اذہان و طبائع کے اختلاف کا لحاظ کرکے میں اسکو یہاں پر دوسرے عنوان سے درج کرتا ہوں۔ سنیئے صاحب خدا نتیجہ کو قبل سے مفصل جانتا ہے۔ لہذا الزام جہل تو رفع ہو گیا۔ اور اب باوجود دانست کے جانچنے میں لطف یہ ہے کہ تحصیل حاصل کا الزام بھی عائد نہیں ہوتا ہے۔ تفصیل اسکی یہ ہے کہ اس نتیجہ امتحان کو جو تعلق خدا کے ساتھ ہے وہ تو حاصل تھا۔ اور جو تعلق اوسکو مخلوق کے ساتھ ہے وہ غیر حاصل تھا۔ جسکا حصول و ظہور اس امتحان کے وجہ سے ہو گیا کیونکہ بغیر اس دار العمل میں آئے ہوئے اور بغیر اس امتحان کے خود اس مجرم کو اور دوسرونکو اسکا مجرم اور مستحق عذاب ہونا کیونکر معلوم ہوتا۔ اور الزام ظلم کا کس طرح سے دفع ہوتا۔ پس یہ ہے وجہ امتحان اور تکلیف شرعیہ کی۔ ناتمام۔

قال عز اسمہ ولعذاب الآخرۃ اکبر لو کانو یعلمون (سورہ قلم) یعنی آخرت کا عذاب دنیا کے عذاب سے قوی ہے۔ کیونکہ وہ وقت غضب خدائی کے کمال ظہور کا ہوگا۔ حتیٰ کہ اسوقت توبہ استغفار عذر معذرت کچھہ مفید نہیں ہی اور کفاروں پر عذاب دائمی اور پایدار ہوگا۔ البتہ مومن گنہگار کو دوزخ سے نکالینگے۔ اور پھر بہشت میں داخل کر دینگے۔ اور یہ قیام دوزخ کی حدت مومنوں کے حق میں بمنزلہ حمام کے ہے۔ یعنی جیسے کسی میلے کچیلے آدمی کو اگر بادشاہ کے قریب لیجاتے ہیں تو اسکو پہلے خوب مل دل کر نہلا دھلا کر صاف ستھرا کر لیتے ہیں۔ تاکہ وہ لائق قربت شاہی کے ہو جاوے۔ گرچہ کبھی اس حصول

صفائی میں تکلیف بھی ہوتی ہی مگر چونکہ یہ عارضی اور فانی تکلیف ہی اور اس پر تمام
وسیلہ ہے حصول نور کبیر کا لہذا خود مومن معذب کو بھی ایسی شدت محسوس نہوگی
جیسی کہ کفاروں کو کیونکہ امید میں بھی ایک تسلی بخش خاصیت ہوتی ہی۔

ثانی — معنی ساق

قال عز اسمہ یوم یکشف عن ساق و یدعون الی السجود (سورہ قلم)
ترجمہ جس روز کھول دیجاویگی اصل اور حقیقت اور بلائے جائینگے سب لوگ طرف
سجدہ کے۔ ساق کے معنی بہت ہیں منجملہ اس کے ایک یہ ہی کہ بمعنی شدت مستعمل ہو پس
بلحاظ مناسبت مقام کے مطلب یہ ہوا کہ ساق دن قیامت کے ایک سخت ترین
ساعت کا نام ہے جس ساعت میں کہ ہر آدمی کے اعمال کی حقیقت کا انکشاف کردیا جاویگا
اور چونکہ دن قیامت تکلیف شرعی کا دن نہیں ہے۔ لہذا دعوت الی السجود
بغرض تکلیف عبادت کے نہیں ہے۔ بلکہ محض مشرکوں کو شرمندہ اور ذلیل
کرانے کے واسطے۔

ثانی قرآن کلام خدا ہے

قال عز اسمہ انہ لقول رسول کریم (سورہ حاقہ) یہ قول رسول کریم کا
ہے۔ اب رسول سے مراد خواہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوں خواہ جبرئیل علیہ السلام
ہوں درحقیقت تو یہ قرآن مجید کلام خدا ہے کیونکہ خدا نے اسکو لوح محفوظ میں ظاہر
کیا ہی اور نظم و ترتیب اسکی محض قدرت خدا سے ہوئی ہی اور اسی عقیدہ پر اجماع امت ہے
مگر اضافت کبھی خفیف مناسبت کے وجہ کر بھی کرتے ہیں پس چونکہ جبرئیل نے
اسکو بحکم خدا آسمان سے لاکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا ہے۔ لہذا محض اسی
اعتبار سے مجازاً اسکو کلام جبرئیل بھی کسی وقت کہا گیا ہے۔ جیسے یہاں یا سورہ
تکویر میں ہے۔ انہ لقول رسول کریم ذی قوۃ عند ذی العرش مکین
مطاع ثم امین ط اور چونکہ جناب محمد مصطفے صلی اللہ علیہ علی آلہ وسلم نے
مخلوق پر اسکو ظاہر کیا ہی اور اس کے طرف بلایا ہے اور اپنی نبوت کا معجزہ قرار

دیا ہے اس لحاظ سے یہ مجازاً کلام رسول بھی کہا گیا ہے۔ جیسے جب کوئی رئیس اپنا
تعلقہ یا کوئی موضع کسی تحصیلدار کے سپرد کر دیتا ہے۔ تو گرچہ حقیقۃً تو وہ علاقہ اس
رئیس کا ہے مگر چونکہ انتظام اور نگرانی تحصیلدار کے سپرد ہے۔ لہذا مجازاً یوں بھی
بولتے ہیں کہ یہ علاقہ فلاں تحصیلدار کا ہے۔ پس اسی طرح سے در حقیقت تو یہ قرآن
شریف کلام خدا ہے اور باعتبار مجاز کے کلام رسول سے بول سکتے ہیں جو شخص اسکو
حقیقۃً غیر خدا کا کلام کہتا ہے۔ یا دل میں وہ ایسا عقیدہ رکھتا ہے وہ کافر ہے۔

قال عزّ اسمہ عالم الغیب فلا یظہر علی غیبہ احدا الا من ارتضیٰ
من رسول۔ (سورہ جن) اللہ غیب کو جانتا ہے پس اپنے غیب کی بجز بر
گزیدہ رسول کے اور کسی کو خبر نہیں دیتا ہے اس آیت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ
اخبار غیب بجز برگزیدہ رسول کے دوسروں کو بتلائے نہیں جاتے ہیں۔ حالانکہ اکثر
اولیاء اللہ کی پیشین گوئیاں مطابق بیان کے صحیح ہوا کرتی ہیں، باوجودیکہ یہ حضرات
رسول نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس آیت سے نہ کبھی ولی اللہ کے کرامت کی نفی
نکلتی ہے نہ اولیاء کے پیشین گوئیوں کا انکار ثابت ہوتا ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے
کہ فلا یظہر علی غیبہ احدا میں غیب ایک لفظ مفرد اور مضاف ہے اور
کوئی دوسرا ایسا لفظ آیت میں نہیں ہے جس سے عموم سمجھا جاوے پس غیب
کو صرف ایک غیب پر محمول کر لینا عمل کے لیئے کافی ہے۔ اب وہ غیب مخصوص
وقت وقوع قیامت ہے۔ لہذا اب مطلب اس آیت کا یہ ہوا کہ اللہ پاک عالم
الغیوب ہے لیکن منجملہ ان غیوب کے وقت وقوع قیامت کی اطلاع کسی کو نہیں دیتا
ہے اور بیشک یہ بات ٹھیک ہے کہ قیامت کبریٰ کے وقوع کا علم سوائے خدا کے
کسی کو نہیں ہے۔ چنانچہ ان ادری اقریب ما توعدون ام یجعل لہ
ربی امدا۔ اس پر ناطق ہے۔ اب بربناء اس توجیہ کے جملہ الا من ارتضیٰ

من رسول کو مستثنار منقطع قرار دیا جائیگا۔

قال عز اسمہ فذوقوا فلن نزیدکم الا عذابا (سورہ لا عمیتساءلون) دوزخیوں سے یہ کہا جائیگا۔ کہ تم عذاب چکھو کیونکہ تم پر برابر عذاب کی زیادتی ہوتی رہیگی۔ استحقاق عذاب سے بڑھکر یا مقدار جرم سے فاضل سزا نہیں ہو گی۔ بلکہ کفار اور مشرکین کو جسقدر یاس نجات اور چھٹکارا سے ہوتی جائیگی۔ اسیقدر عذاب کی سختی بھی زیادہ محسوس ہوا کریگی۔ کیونکہ اُمید میں پھر بھی ایک گونہ تسلّی ہوتی ہے اور قرآن سے کفار کے تخفیف عذاب یا خروج عن النار کی کوئی خبر نہیں ہے۔ بلکہ خود کفار اور مشرکین کا عقیدہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اپنے شرک و کفر کو جلّ جلانیوالا جرم نہیں سمجھتے ہیں۔ ہاں ایسی خواہش مشرکوں کی ضرور ہو گی کہ اگر پھر انکو دار العمل میں بھیجا جاوے۔ اور وہ وہاں جاکر ایمان بالغیب لاویں اور مطابق شریعت الٰہی کے عمل کریں تب البتہ صورت فلاح اور نجات کی ہے ورنہ جس کفر اور شرک کا کہ دنیا میں ارتکاب کر چکے ہیں۔ اسکی سزا بحالت قیام دوزخ کی طرح سے قابل انقطاع نہیں ہے۔ چنانچہ وہ سب ایسی درخواست بھی پیش کرینگے کہ ربنا اخرجنا فیھا فان عدنا فانا ظالمون لیکن جو درخواست انکی رد کردیجائیگی۔ اور یہ جواب ملیگا قال اخسئو فیھا ولا تکلمون (سورہ مومنون) اور مسلمانوں کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ مشرک کی نجات نہیں ہے۔ لیکن برخلاف عقیدہ جمہور اہل اسلام کی بعض تحریر میری نظر سے ایسی بھی گذری ہے کہ جسمیں یہ بتایا گیا ہے کہ شرک بھی ایک جل جانے والا گناہ ہے گرچہ اس کے جلنے میں بہ نسبت اور جرائم کے بہت طویل مدت درکار ہو گی ایسے ایسے موقعہ پر مدعی سُست اور گواہ چُست کی ضرب المثل صادق آتی ہے۔ قرآن نے تو شرک کو ناقابل عفو بتایا ہے اور مشرک کے لئے نعیم جنت کو

حرام کیا ہے۔ کما قال تعالیٰ ونادیٰ اصحاب النار اصحاب الجنۃ

ان افیضوا علینا من الماء او مما رزقکم اللہ قالوا ان اللہ حرمہما

علی الکافرین۔

قال عز اسمہ والنازعات غرقاً والناشطات نشطاً والسابحات

سبحاً فالسابقات سبقاً فالمدبرات امراً (سورہ نازعات) اسکی تفسیر

ربع السالکین

علمائے کرام نے چند طریقہ پر کی ہے۔ منجملہ اس کے ایک عارف کی تفسیر جو میرے نزدیک پسندیدہ ہے اسی کو میں یہاں پر صوفیانہ مسلک کے ناظرین کی بہجت خاطر کے واسطے لکھتا ہوں یعنی اسمیں اللہ پاک نے اپنے مخلص بندوں کی قسم کھائی ہے۔ اور اس خوش اسلوبی اور معجز نما پیرایہ سے اس قسم کو بیان کیا ہے کہ جس کے ساتھ ساتھ سالک کے مقامات سلوک کی تدریجی ارتقا اور کیفیت حصول اور نتیجہ سلوک کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے اور ہر درجہ کے سالک کی ہمت افزائی بھی ہوتی گئی ہے۔

تفصیل اسکی یوں ہے کہ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ کسی کام کا بغیر استاد اور رہبر کے انجام پانا دشوار ہے۔ اور جس قدر اہم اور اعلیٰ درجہ کا کام ہوگا۔ اسی قسم کے معلم اور ہادی کی اسمیں ضرورت ہوگی۔ چنانچہ جناب محمد الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چونکہ نبوت عامہ عطا ہوئی ہے۔ اور آپ سید ولد آدم ہیں، لہذا حضور کی تعلیم خداوند قدوس نے بذریعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے کی ہے

قال علمہ شدید القویٰ۔

الغرض مبتدی کو ہر کام کی ابتدا میں ضرورت اور تلاش استاد کی پیش آتی ہے پھر مطلوب حقیقی کے وصال کے واسطے کیسے زبردست ہادی کی ضرورت پڑتی ہے محتاج بیان نہیں۔ لہذا دستور یہی ہے کہ جو کوئی کشور باطن کی سیاحت کا ارادہ کرتا ہے وہ کسی شیخ کامل کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے۔ اور اسکو اس راہ کا رہبر قرار دیتا ہے۔ اب اس نئی دنیا میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی اسکو اپنی بری عادتوں کو یکقلم

چھوڑنا پڑتا ہی۔ اور چونکہ عرصہ دراز تک وہ ان عادات سے مالوف رہ چکا ہے
اور ان لذات دنیاوی کی محبت اس کے قلب میں سرایت کر چکی ہی۔ لہذا ان
سب کو قلب سے نکالنے میں ابتداءً سالک کو نہایت جد وجہد کی ضرورت پیش
آتی ہی، جسے والنازعات غرقاً سے تعبیر کیا گیا ہی۔ یعنی ان برائیوں کو اپنی ذات
سے علیحدہ کرنے میں اسکو بجز مساعی میں پورا مستغرق ہونا پڑتا ہے۔ اور ہر ایک عادت
کے چھوڑنے میں اسکو گویا جانکندنی کی سی تکلیف ہوا کرتی ہی۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق اول چوں بت خونی بود　　　تا گریزد ہر کہ بیرونی بود

یعنی عشق کا حملہ اول بڑا سخت ہوتا ہی۔ کیونکہ مال و دولت بال بچہ کی محبت دل
سے نکالنا کچھہ آسان تو ہی نہیں لیکن جس نے ہمّت سے کام لیا اور مطابق ہدایت
پیر کے اپنی جد وجہد میں مشغول ہی۔ اس پہلی منزل کے سالک کے قصد و ہمت اور
کوشش کی بھی خدا نے یہ قدر دانی کی ہی کہ خداوند تعالےٰ نے اس سورہ کی پہلی
آیت میں ان لوگوں کی بھی قسم کھائی ہے۔ سچ ہے، کان سعیکم مشکوراً۔
حاصل کلام یہ ہی کہ جب سالک ان تکالیف کو برداشت کر لیتا ہی۔ اور منزل مقصود
کیطرف گرم رو رہتا ہی۔ تو اس کے جسمانی تعلقات اور مادی اشیاء کی محبت میں
اسقدر کمی ہو جاتی ہی۔ کہ وہ ترقی پاکر اس راہ کی دوسری منزل میں پہونچتا ہی۔ جسکو
والناشطات نشطاً سے تعبیر کیا گیا ہی۔ یعنی قسم ہی ایسے لوگوں کی کہ جنکو فرحت
اور نشاط اپنے کام میں حاصل ہی۔ یعنی اب اس دوسرے درجہ کے سالک کو امور
شرعیہ اوراد اور اشغال و وظائف کی بجا آوری (قیام اللیل) میں بجائے تکان تسلی دل سکت
کے خوشی اور راحت ہوا کرتی ہے اور جس طرح ان امور حسنہ کو پہلی منزل میں کرنا
دشوار تھا۔ اب وہ اعمال اس کے واسطے موجب راحت ہو جاتے ہیں۔ اور پہلے
جن برے کاموں کو چھوڑنا اس پر دشوار تھا۔ اب اسکا اس سے صدور محال

ہوجاتا ہی۔ الغرض کچھ عرصہ تک اس دوسری منزل میں رہ کر اس نے اپنے کو کچھ اور زیادہ متخلق باخلاق اللہ بنالیا تو پھر اسکی ترقی ہوئی اور اب وہ تیسرے درجہ میں پہونچا جس کے طرف والسابحات سبحا سے اشارہ ہی یعنی اس منزل میں سالک بحر محبت الٰہی میں گویا تیرنے لگتا ہی۔ لیکن اس مقام میں سالکوں کی مختلف حالتیں ہوا کرتی ہیں یعنی فالسابقات سبقاً قسم ہے ان لوگوں کو جو اپنے کام میں اپنے ساتھیوں پر سبقت لیجاتے ہیں لیکن اس جدوجہد میں بعضوں کی ترقی اس حد تک ہو جاتی ہی کہ انکو فالمدبرات امراً کا تمغہ ملجاتا ہے۔ اور یہ ایسی حالت ہے کہ جس میں انسان گویا مراتب بشری سے بالکل علیحدہ ہو کر صفات ملکوتی سے اس طرح متحلی و آراستہ ہو جاتا ہی کہ اب یہ سالک بھی ملائکہ مدبرین میں شامل ہو جاتا ہی۔ اور اس سے بھی وہ حیرت انگیز امور نظام عالم میں صادر ہونے لگتے ہیں، جو کہ ملائکہ مدبرین سے متعلق ہیں۔ اور انکو اپنے مریدین و متوسلین کے کام کی تدبیر اور رہنمائی کا اچھا خاصہ ملکہ ہو جاتا ہی۔ اور یہی لوگ ابدال اور اقطاب کہلاتے ہیں۔ اور یہی حضرات شیخ کامل اور پیر دستگیر کے مصداق ہیں۔ اور انھیں مبارک نفوس کو مسند ارشاد زیبا ہے۔ جیساکہ حضرت **مخدوم شاہ شرف الدین احمد بہاری رحمۃ اللہ علیہ** تحریر فرماتے ہیں:۔

کہ پیری و مریدی نہ آسان کاریست بلکہ مہم اسراریست۔ مگر اب تو اس ناخدا ترسی کے زمانہ میں یہ حال ہے کہ جسمیں دنیا کے کسی کام کی صلاحیت نہیں ہوتی ہی۔ وہ اپنے واسطے ذریعہ تحصیل معاش یا تو جسمانی معالجہ کو قرار دیتا ہے یا روحانی معالجہ کو یعنی یا تو وہ طبیب بنجاتا ہے یا دہقانوں کا پیر۔ حالانکہ یہ دونوں امور نہایت جوابدہی اور اہمیت کے ہیں۔ آجکل ساٹھ فیصدی ایسے جاہل طبیب نظر آتے ہیں کہ جنکو منفج کا املا بھی لکھنا نہیں آتا ہے۔ اور پچاس

فی صدی ایسے خودرو پیر ہیں جنکو تفوق کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ مگر اہل کمال کے دھوکہ میں انکا کام بھی نکل جاتا ہے۔ ہمارے اعلیٰحضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن علیہ الرحمہ فرمایا کرتے تھے کہ پیر کی تین قسمیں ہیں۔ پیر لٹھا۔ پیر پتا۔ پیر پتھر۔ پیر لٹھا تو یہی فالمدبرات امرا کی جماعت ہے۔ جو خود بھی منزل مقصود تک سلامتی سے پہونچتے ہیں اور مریدونکو بھی ڈوبنے نہیں دیتے ہیں۔ اور پیر پتا وہ ہیں جو خود تو امواج کے تھپیڑے کھاتے ہوئے کسی نہ کسی طرح پہونچ جاتے ہیں لیکن مریدونکو سنبھال نہیں سکتے۔ اور پیر پتھر وہ جو خود بھی ڈوبا اور مریدوں کو لے ڈوبا بہرکیف طالب صادق کو شیخ کامل کی تلاش ضرور چاہیئے۔ گرچہ تیسرے اور چوتھے درجہ والے اصحاب بھی فی الجملہ اس کام کے واسطے موزونیت رکھتے ہیں اور ان ہی مبارک نفوس کا وجود بھی اکثر پایا جاتا ہے اور ان کے ہاتھوں پر بیعت بھی فی الجملہ مفید ہے مگر یہ لوگ صرف اہل حال ہیں۔ اور اعلیٰ قسم کے پیر یعنی اہل مقام یا صاحب نسبت کا وجود اندنوں بہت کمیاب ہے۔ جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں:۔

ہست بسیار اہل حال از صوفیاں + کم بود اہل مقام اندر میاں

حال چوں جلوہ ست زاں زیبا عروس + دین مقام ان خلوت آمد با عروس

جلوہ کردہ عام و خاصان را عروس + خلوت اندر شاہ باشد با عروس

شیخ کامل صاحب نسبت یا اہل مقام یا مدبر الامر کے اوصاف کو مولانا یوں بیان فرماتے ہیں ؎

اولیا راہست قدرت از الٰہ + تیر جستہ باز گرداند ز راہ

ید اللہ فوق ایدیہم تو باش + ہمچو دست حق بر ایشاں رزق باش

دام داران زعہد خداوند رہان + ہمچو بازان سبز کن فرش جہاں

مگر ان سب مدارج کے حصول کے لئے سب سے پہلی ضرورت تو آئندہ کی

محبت کو قلب سے نکال لینے کی ہے اور پھر سخت ترین جد و جہد کی ہے ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں + ایں خیال ست و محال ست و جنوں

مگر سالک راہِ ہمت نہ ہارے اور اُسے مَن جَدَّ وَجَدَ کا مقولہ بھولنا نہیں چاہیئے بقول سعدی ؎

آدمی زادہ طرفہ معجونیست + از فرشتہ سرشتہ وز حیوان

گر کند میل این شود بہ از این + ور کند قصد آن شود بد از آن

دوستو! اس منزل کی دشواری کا موازنہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ایک معتبر شخص کا یہ واقعہ ہے کہ اسکو فضول گوئی کی عادت تھی اس لئے من سکت نجا پر عمل کرنیکی پوری کوشش کیا لیکن چار پانچ برس کے عرصہ میں وہ کسیقدر اس ارادہ میں کامیاب ہوا۔ غور کرنیکا مقام ہے کہ اتنی محنت پر تو اسکو ایک زیادہ گوئی کے چھڑانے میں کتنا وقت درکار ہوا۔ بھلا جملہ عیوب کے ترک اور دفع کرنیمیں کیسی محنت اور کتنی مدت چاہیئے مختصر گذارش یہ ہے کہ راہ سلوک کے سارے امور وجدانی ہیں، بیانی نہیں۔ اللھم اعنی علی ذکرک وشکرک وحسن عبادتک -

قال عز اسمہ والارض بعد ذلک دحٰھا۔ (سورہ نازعات) اصل بات یہ ہے کہ زمین کی پیدائش قبل ہوئی ہے! اور آسمان کی بعد میں لیکن البتہ آسمان کو بنانے کے بعد زمین پھیلائی گئی ہے۔ اور قابل انتفاع بنائی گئی ہے۔ اس لیے ثم بعدہ کی اس آیت سے تعارض نہیں ہے جس سے کہ بظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آسمان زمین کے بعد بنایا گیا ہے یعنے قل ائنکم لتکفرون

بالذی خلق الارض فی یومین وتجعلون لہ انداداً ط ذلک رب

العالمین ج وجعل فیھا رواسی من فوقھا وبارک فیھا

وقدر فیھا اقواتھا فی اربعۃ ایام ط سواءً للسائلین ثم استوی

پہلے زمین بنائی گئی پھر آسمان

الی السماء وھی دخان ؕ اور والارض بعد ذلک دحٰھا سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زمین بعد آسمان کے پھیلائی گئی ہے۔ کیونکہ دحی کا مصدر دحو اور دحو لغت میں بمعنی گستردن ہے نہ بمعنی ساختن۔

قال عزاسمہ لترکبن طبقا عن طبق۔ (سورۃ انشقاق) خدا نے لیل اور بالجمعہ اللیل اور ماہ کامل کی قسم کھاکر یہ بتلایا ہے کہ لترکبن الخ یعنے البتہ تم سوار کیئے جاؤگے ایک حالت سے طرف دوسری حالت کے۔ چونکہ جیسے انسان پر اب تک مختلف حالتیں گذر چکی ہیں، یعنے روز ازل سے جو یہ چلا تو معلوم کہاں کہاں کی اس نے سیر کی کچھ دنوں تک تو جماداتی زندگی اسکی کٹی پھر نباتی پھر غذا بنکر معدہ میں گھومتا رہا۔ پھر اخلاط کی شکل میں عروق کی سیر کرتا رہا۔ اور پھر اس نے اپنے قالب کو چھوڑکر نطفہ کی شکل میں اپنے کو پیش کیا۔ پھر جب یہ رحم میں پہونچا۔ تو وہاں بھی اُنھوں نے کئی بھیس بدلے بالآخر اب اس دنیا میں آکر انسانی قالب میں کوئی فرشتہ بنا ہے تو کوئی انسان صورت مجسم شیطان سے کم نہیں ہے اسی طرح یہاں سے اس کو قبر اور میدان محشر اور صراط کا سفر درپیش ہے۔ خلاصہ یہ کہ تا وصول جنت یا جہنم کے اسکا سلسلہ سفر جاری رہیگا۔ البتہ جنت میں مومنوں کو اور جہنم میں مشرکوں کو پہونچنے کے بعد قیام دوامی نصیب ہوگا۔ اور اس جگہ پر جاکر انسان کے سفر کا سلسلہ منتہی اور منقطع ہو جائیگا۔ اور تجربہ نے بتا دیا ہے کہ اب تک جتنی حالت اسکی ہوتی گئی ہے۔ اسمیں ہر مابعد والی حالت اپنے ماقبل سے اعلیٰ اور اشرف ہوتی گئی ہے۔ لہذا آدمی کو پوری کوشش اس امر کی کرنی لازم ہے کہ اس موجودہ حیات دنیا سے نکلکر اس سے اچھی حیات حاصل ہو اور وہاں جاکر زیادہ معزز بن جاوے کیونکہ انسان کی کامیابی کا اصلی راز یہی ہے۔ اور اگر کہیں اس موجودہ زندگی سے بدتر زندگی وہاں گذارنی ہو اور اس دنیا کے چھوٹنے کی حسرت باقی رہ گئی ہو۔ پس یہی نہایت خسران ہے انسان

کے لیئے چنانچہ اس سفر انسانی کو مولانا یوں بیان فرماتے ہیں ؎

آمدہ اول بہ اقلیم جماد + از جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد + وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چوں بحیواں اوفتاد + نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں + خاصہ در وقت بہار و ضیمراں
ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت + تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت
عقلہائے اولینش یاد نیست + ہم ازیں عقلش تحول کردنی ست
تا رہد زیں عقل پر حرص و طلب + صد ہزاراں عقل بیند بوالعجب
گرچہ خفتہ گشت و ناسی شد ز پیش + کے گزارند دراں نسیان خویش
باز ازاں خوابش بہ بیداری کشند + کہ کند بر حالت خود ریشخند
چوں دوم از اولیست بہتر ست + پس فنا جو و مبدل را پرست

قال عز اسمہ ووجدک ضالا فہدیٰ (سورہ والضحیٰ) یہاں پر مفسرین میں بہت اختلاف ہے لیکن سب سے پسندیدہ اور مرغوب قول یہ ہے کہ ضلال کو معنی محبت لیا جاوے۔ کما جاء فی قصۃ یعقوب ع انک لفی ضلالک القدیم یعنی تو انہی قدیم محبت میں مبتلا ہے پس اب اس آیت کا ترجمہ یوں ہوا کہ جبکہ تمکو تمہارے رب نے اپنی محبت میں سرشار پایا۔ پس بہترین طریقہ عبادت کا بتلادیا کیونکہ قبل بعثت کے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی یاد اور عبادت کیا کرتے تھے پھر بذریعہ نزول وحی کے آپ کو اللہ نے اپنے خوشنودی کے اعمال پر مطلع کردیا اور جملہ طالبان خدا کیواسطے آپکو ہادی اور رہنما بنادیا۔

قال عز اسمہ کلا ان الانسان لیطغیٰ ان راٰہ استغنیٰ (سورہ علق) تحقیق کے انسان البتہ بحالت دولت کے سرکش ہو جاتا ہے کیونکہ اس دولت

کو وہ محض اپنی عقل و کوشش کا ثمرہ سمجھتا ہی اور لطف خدا کا خیال بھی کم رہتا
ہی جس نے کہ ان کوششوں کو کامیاب کیا بس خالق کے ساتھ تو معاملہ یوں بگڑا اور
مخلوق کے ساتھ اس طرح کہ غربا کو وہ بنگاہ تحقیر و ذلت دیکھنے لگتا ہی اور اپنی دولت
میں انکا حق نہیں سمجھتا ہی اور یہی وجہ ہے کہ ہر انسان اپنے کمال غصہ کا اظہار
اسی کے مقابلہ میں کرتا ہی کہ جن سے یہ خود دولت و ثروت علم و قوت میں زیادہ ہوتا ہی
اور فریق کسی سبب سے اس سے کمزور ہو، ورنہ بڑے لوگوں کے سامنے اظہار غصہ کی
ہمت نہیں پڑتی ہی سو ہاں سب چاپلوسی اور خوشامد کے ساتھ اپنے آئے ہوئی غصہ
کا اختصار کیا کرتے ہیں، ہاں اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جو اس حالت میں سرکشی
اور طغیان سے محفوظ رہتے ہیں ع - گر بدولت برسی مست نگردی مردی -

شب
قال عزاسمہ لیلتہ القدر خیر من الف شہر - (سورۂ قدر)
قدر بہتر ہے ہزار مہینہ سے یعنی اسی ایک رات کی عبادت کا اجر اور ثواب غیر زمانہ کے
ہزار مہینہ کی عبادت اور ثواب سے زیادہ ہی - **واضح ہو کہ** فضیلت لیلۃ القدر تو
کسی مسلمان سے مخفی نہیں ہی لیکن شب قدر کی حقیقت میں بڑا اختلاف ہی - بلکہ عوام
میں عجیب و غریب باتیں مشہور ہیں کوئی کہتا ہے کہ ہمنے ان آنکھوں سے درختوں اور
دیواروں کو زمین پر گرکر سجدہ کرتے ہوئے دیکھا - اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ
مکانات اپنی اصلی حالت پر آگئے - لہذا عوام کی اطلاع کیواسطے حقیقت شب قدر
کو کتب معتبرہ سے نقل کرتا ہوں وہ یہ ہی کہ اس مخصوص رات میں ملائکہ جوق جوق
آسمان سے زمین پر تشریف لاتے ہیں - اور مومن کو سلام کہتے ہیں - اور حضرت جبرئیل
علیہ السلام جو کہ رئیس الملائکہ ہیں وہ خاصان خدا سے مصافحہ بھی کرتے ہیں - اور یہی
وقت اصل موقعہ ادراک لیلۃ القدر کا ہی - ہملوگ چونکہ فرشتوں کو دیکھ نہیں سکتے ہیں
اسلیئے جو کوئی شخص مسلم اس رات میں بغرض پانے شب قدر کی فضیلت کے عبادت

میں مشغول رہا ہو۔ اور رات کے کسی حصہ میں اس نے اپنے قلب میں رقّت محسوس کیا۔ اور رونگٹے اس کے کھڑے ہو گئے۔ یا آنکھوں سے قطرات اشک بے اختیار جاری ہو گئے ہوں۔ تو اسکو یقین کرنا چاہیئے کہ محنت اسکی ٹھکانے لگی۔ اور اس نے اس مقبول ساعت کو پالیا۔ جس کو کہ عوام شب قدر دیکھنا یا شب قدر پانا بولتے ہیں۔ پس عین اسی حالت میں جس نے تین مرتبہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کہا تو اسکا گناہ معاف ہو جاتا ہے اور جہنم سے اسکو نجات ملتی ہی۔ اور وہ شخص جنتی ہوتا ہی۔ اور دوسری دعا بھی اوسوقت بہت زیادہ قبول ہوتی ہی۔ پس جو شخص کہ شب قدر پاوے اسکو لازم ہی کہ پہلے تین مرتبہ کلمہ طیبہ پڑھے اور پھر ادعیہ ماثورہ سے جو یاد آجاوے اسکو پڑھے۔ اور سلسلہ نزول ملائکہ کا ابتدا رات سے شروع ہو جاتا ہی۔ اور صبح صادق کے قبل تک رہتا ہی۔ لہذا یہ کچھ ضروری نہیں ہی کہ جس وقت عمر نے شب قدر پائی عین اسی وقت زید بھی دیکھے بلکہ ممکن ہے کہ دونوں شخصوں نے شب قدر پائی ہو۔ اور پھر بھی دونوں کے ادراک میں تفاوت و اختلاف وقت ہو۔ پس نزد سالک محققین پر عوام کے لیئے شب قدر کی حقیقت یہی ہی جو مذکور ہوئی۔ اور حجر و شجر چھت و دیوار وغیرہ کا سجدہ میں اس طرح سے گرنا کہ انسان اسکو دیکھے گرچہ قدرت خدا کے نزدیک تو محال نہیں ہی۔ لیکن کتب معتبرہ میں اسکا کوئی ثبوت نہیں پایا جاتا ہی۔ یہ دوسری بات ہی کہ اہل اللہ کی وجدانی طور سے اس موقعہ پر کوئی اور بھی عجیب و غریب کیفیت ہو جاتی ہو۔ دوسری بات متعلق شب قدر کے یہ ہی کہ بوجہ چند مصلحتوں کے اس رات کی قطعی طور سے تعین بھی امت کو بتلائی نہیں گئی ہی۔ مگر اکثر روائیتوں کے بنا پر شب ۲۷ رمضان المبارک میں اسکا وقوع معلوم ہوتا ہی۔ اور بعض روائیتوں سے رمضان المبارک کی دوسری تاریخوں میں۔ لیکن ماہ وقوع شب قدر کا بلا اختلاف ماہ رمضان شریف معین اور مسلّم ہی۔ بلکہ رمضان کے عشرہ

اخیرہ میں۔ بربناء اختلاف روایتوں کے ممکن ہی کہ وہ مبارک رات رمضان شریف کے عشرہ آخری میں کبھی کسی سال کسی تاریخ میں اور کسی دوسری تاریخ میں واقع ہوا کرتی ہو یہ کچھ ضرور نہیں ہی کہ ہر سال مثلاً شب ۲۷ ہی کو ہوا کرے لیکن مسلم کو لازم ہے کہ پورے ماہ رمضان شریف میں اسکا انتظار کرے۔ ورنہ کم از کم آخر عشرہ کی ہر راتوں میں تو ضرور شب قدر کی تلاش اور جستجو میں سرگرم عبادت رہے۔ کیونکہ جو بندہ یابندہ۔

قال اللہ تبارک وتعالیٰ قل ھو اللہ احد (سورہ اخلاص) اے نبی کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہی۔ خدا کی وحدانیت ایسی مسلمہ ہی کہ اس پر دلیل لانے کی حاجت نہیں ہی۔ مگر چونکہ خود قرآن پاک میں توحید پر مختلف مواقع میں دلیلیں بیان ہوئی ہیں۔ جیسے دلیل تمانع وغیرہ۔ لہذا تبرکاً میں بھی اپنی اس کتاب میں ایک دلیل وحدانیت باریتعالیٰ کی لکھکر کتاب کو ختم کرتا ہوں۔ یہ تو سب کو معلوم ہی کہ خدا کا نام ہی اس ذات پاک کا جو کہ واجب الوجود لذاتہ ہی یعنی وجود اسکا خانہ زاد ہی عطائی غیر نہیں ہی۔ اور جملہ موجودات کا وجود اسی کا عطیہ ہی ذاتی نہیں جب چاہا موجود کردیا اور جب چاہا چھین لیا۔ لہذا قطعاً اور یقیناً واجب الوجود صرف ایک ذات اللہ پاک کی ہی اور باقی سب ممکن الوجود ہیں کیونکہ اگر بفرض محال دو خدا ہوں تب تو اسوقت ایک ما بہ الامتیاز کی بھی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ ہر ما بہ الاشتراک کیواسطے ما بہ الامتیاز کا ہونا ضروری ہے پس اسوقت نتیجہ یہ نکلتا ہی کہ خدا مرکب ہوا دو جز سے ایک جز ما بہ الاشتراک بین الاثنین سے دوسرا جز ما بہ الامتیاز احدھما عن الاخر سے الغرض اسوقت ترکیب سے انکار نہیں ہو سکتا ہی پس جب مرکب ہوا تو جس طرح ہر مرکب شئے کو اپنے وجود میں اجزاء کی احتیاج ہوتی ہی۔ خدا بھی اپنے وجود میں اجزا کے وجود کا محتاج ہوگا۔ اور چونکہ جز شئی کا عین شئی نہیں ہوتا ہی۔ بلکہ اس شئی کا غیر

ہوتا ہی جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ ہر مرکب شئے اپنے وجود میں محتاج بالغیر ہے اور جو محتاج بالغیر ہوتا ہی۔ وہ واجب الوجود نہیں ہوتا ہے بلکہ ممکن الوجود ہوتا ہی۔ لہذا خدا کو بھی ممکن الوجود کہنا ہوگا۔ اور امکان منافی شان الوہیت ہی پس یہ خرابی کیوں لازم آتی ہی محض اس صورت میں کہ جب دو چار فرض کیا جائے۔ کیونکہ اسوقت واجب الوجود لذاتہ ممکن الوجود لذاتہ ہو جاتا ہی۔ اور واجب کا ممکن ہو جانا محال ہے۔ لہذا دو خدا کا وجود بھی محال ہے پس معبود وہی ایک ذات اللہ پاک کی ہے جس کی کہ مسلمان پرستش کرتے ہیں۔ اور باقی سب اسکی مخلوق ہے۔ اور سب اسکے طرف اپنے وجود اور اپنی ضروریات میں محتاج ہیں

امنت باللہ الذی لا الہ الا ھو وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر۔ اللھم تقبل منی ھذہ الرسالۃ واجعلھا نافعۃً للمسلمین واعف عنی کلما وقع فیھا من الخطایا انک انت التواب الرحیم۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

تمام شد

تاریخ طبع تحفۂ احباب

از جناب مستطاب نخلبند گلزار معانی و بیان عمدۃ الشعراء ہندوستان
سخنور عالی درجت خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی

مسیح العصر ابراہیم صاحب — محقق ماہر علم و کمالات
مصنف تحفۂ احباب کے ہیں — مطالب جس کے ہیں بحر افادات
عدو اسلام پر کچھ معترض تھے — نہ تھے معلوم انھیں مذہب کے حالات
مصنف نے بہت محنت اُٹھا کر — لکھے قرآن سے مسکت جوابات
کتاب ایسی ہی یہ جامع دمانع — کہ جس سے ہو گئی سب معترض مات

کہی عشرت نے یہ چھپنے کی تاریخ
یہ اچھا ہے جواب اعتراضات
۱۹۲۵ء

تقریظ

اعلیحضرت منبع فیوض و برکات مظہر خوارق و کرامات وحید العصر فی علوم الشریعت و فرید الدہر فی رموز الطریقت قدوۃ العارفین زبدۃ السالکین مولانا و مرشدنا سید محمد علی صاحب قادری نقشبندی رحمانی مونگیری ادام اللہ ظلہ العالی علی روس الطالبین۔

تحفہ احباب مؤلفہ عزیزی مولوی حکیم محمد ابراہیم رحمانی کے بعض بعض مضامین مجھے سنائے گئے۔ مؤلف سلمہ نے اردو زبان میں قرآن مجید کی نہایت قابل قدر دینی خدمت کی ہے اس پر آشوب زمانہ میں اس کتاب کا اردو داں مسلمانوں کے لیئے پڑھنا نہایت مفید ہے۔ خداوند کریم اس کتاب سے مسلمانوں کو نفع بخشے اور مؤلف کو دارین میں اجر نیک عطا فرماوے۔ آمین!

محمد علی

منظور ہے گذارش احوال واقعی   اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

دور حاضرہ میں جبکہ ہر طرف سے دشمنان دین متین کے ناپاک حملے اسلام پر ہو رہے ہیں اور خاصکر آریہ جماعت ہندوستان کے مختلف حصوں میں مخالف اسلام خیالات کی اشاعت میں نہایت سرگرمی سے مشغول ہے پس اب ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ آئندہ اپنی غفلت سے دشمنوں کو فائدہ اٹھانے کا موقعہ نہ دیں بلکہ جس سے جو ہو سکے اسلام کی علمی خدمت پر آمادہ ہو جاوے۔ چنانچہ اسی بنا پر میں نے جو ایک حقیر خدمت ملت بیضا ادا کی ہے وہ ناظرین کے پیش نظر ہے۔ چونکہ زبان اردو میں کتاب ہذا منتخب آیات کی تفسیر میں غالباً پہلی مثال ہے۔ لہذا اگر علماء نے اس کو مستحسن سمجھا۔ اور قدر دانوں نے ہمت افزائی کی تو انشاء اللہ تحفہ احباب کے باقی حصوں کو بھی بہت جلد آپ حضرات کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا، بلکہ علماء کرام اگر توجہ فرماویں تو اسی طرز پر تحفہ سے بہتر تفسیریں آپ کی مساعی سے عالم شہود میں جلوہ نما ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ اگر کسی نے جانفشانی سے اردو میں کوئی بڑی تفسیر لکھی تو عموماً افراد قوم اس کے پڑھنے میں ہی اپنا وقت صرف نہیں کرتے ہیں۔ ہاں تھوڑے آدمی البتہ اس کے پڑھنے والے ہوتے ہیں۔ لہذا مقتضائے وقت یہی ہے کہ علمائے کرام مختلف قرآن کی چھوٹی چھوٹی تفسیریں لکھ کر عام مسلمانوں کے مذہبی معلومات میں اضافہ فرماویں تاکہ عوام کو قرآن کے سمجھنے کا شوق پیدا ہو۔ اور مخالفوں کے دام تزویر سے یہ لوگ محفوظ رہیں،

اب میں اپنے اُن جمیع احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنکی تحریک سے یہ خدمت انجام پذیر ہوئی ہے جس میں خصوصیت کیساتھ جناب **سید شاہ بینظیر عالم** صاحب ساکن محلہ خلیفہ باغ و جناب شیخ **سجاد علی** صاحب و جناب شیخ **کمال الدین** صاحب ساکنان محلہ معین الدین چک شہر بھاگلپور کے اسمائے قابل تذکرہ ہیں، اس لئے کہ پہلے یہ کتاب بغرض طباعت کلکتہ کی ایک ایسی کمپنی کے پریس میں دیگئی تھی کہ جہاں سے نہ تو وعدہ کیمطابق مجھے چھپی ہوئی کتاب ملی اور نہ باوجود میری بیحد کوشش کے پیشگی کے روپے مجھے اب تک واپس ملے۔ چونکہ منیجر صاحب کے چند وعدوں کا میں نے قریب چند ماہ تک نہایت سختی سے انتظار کیا اور ناکام رہا۔ اس لئے زر دادن و درد سر خریدن کی مشہور مثل کی صداقت کا تجربہ اچھی طرح ہو گیا مگر اور بھی بعض وجوہ سے کچھ ایسے اسباب زیر باری کے پیدا ہو گئے تھے کہ جنکی وجہ سے میں نے بالفعل تحفہ کی اشاعت کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا، لیکن میرے ان احباب ثلثہ نے عین وقت پر اس کتاب کی چھپوائی میں مالی اعانت کی بھی شرکت فرما کر خاکسار کیساتھ خلوص و محبت اور اپنی علمی دوستی کا ایسا اچھا ثبوت بہم پہنچایا کہ جس سے تحفہ کی طباعت میں وہ دشواری مطلق باقی نہ رہی۔ فجزاهم الله فی الدارین خیرا۔ وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین والصلوٰة والسلام علی سید المرسلین وعترته اجمعین۔

خادم القوم **حکیم محمد ابراہیم بہاری** غفرلہ الباری

رواءالشفاء

یہ عرق جاذب انجارات
ورم جگر اور ورم طحال کے
واسطے بھی
مفید ہے
۱۰/ عہ

طبی عجب

دوا مقوی معدہ [illegible]
منفعت [illegible]
بہت
نافع ہے

واضح ہو

کہ جسطرح
علمار کا فرض تالیف و تصنیف
ہے اسیطرح سے دولتمندوں پر دینی کتابوں
کی اشاعت ضروری ہے۔ لہذا مستطیع اصحاب پر
لازم ہے کہ کتاب ہذا کو کثرت سے خرید فرما کر غربار مسلمین
اور مذہبی درسگاہوں میں تقسیم فرما کر داخل حسنات ہوں۔ امید
ہے کہ مبتدی طلبار کو اسکا مطالعہ فن تفسیر کے سمجھے
میں مفید ثابت ہوگا اور عوام کیواسطے بھی اسمیں
بہتری مسائل موجود ہیں۔

تحفۂ احباب کے ملنے کا پتہ ہے

حکیم
محمد ابراہیم
محلہ خلیفہ باغ بھاگلپور

ملنے کا پتہ
حکیم محمد ابراہیم محلہ خلیفہ باغ بھاگلپور